خطبہ صدارت

شعبہ اردو

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور

اجلاس پنجم سنہ ۱۹۲۸ء

صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں چھپا

عرض اخلاص
ایک تقریر جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں ضرورت زمانہ کے مطابق ضرور عمدہ تعلیم پائیں مگر اس طرح کہ شعائر اسلام پر نہایت استحکام کے ساتھ قائم رہیں اور سادہ اسلامی معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین
یعنی وہ مقالہ جو نواب صدر یار جنگ بہادر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اساتذہ و طلبہ کے روبرو پڑھا۔

سرسید کی یاد
یعنی وہ مقالہ جو نواب صدر یار جنگ بہادر نے سرسیڈے کے موقع پر ۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو مسلم یونیورسٹی کے رام پور حامد ہال (یونین ہال) میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر نہایت دلچسپ اور محققانہ پیرایہ میں کیا ہے۔

اسلامی اخلاق
مضمون اخلاق پر دل نشیں بحث کرنے کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق کثیر التعداد حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے اور اخلاق جیسے خشک مضمون کو شگفتہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بڑوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

ملنے کا پتہ: شروانی بک ڈپو۔ شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت

شعبۂ اردو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور

لاہور اور اردو

ادب نواز شرفا! ذرہ نوازی کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ ایک خاکسار کو بزم ادب میں یاد فرمایا' صدر میں جگہ بخشی۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو۔ اردو کے دو قدیم گہوارے' لاہور اور دکن ناچیز کے انتخاب نے پرانے تعلقات تازہ کئے۔ حیدر آباد آج بھی ترقیِ اردو کا مرجع ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے اُس کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ یادش بخیر انجمن ترقی اردو بھی وہیں پھلی پھولی۔ اور یہ سب کچھ شہریار دکن خلّد اللہ ملکہ کے زیر سایہ ہو رہا ہے لاہور نے بھی زمانۂ حال میں اردو کی خدمت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ رسالہ مخزن نے جدید تعلیم یافتہ دماغوں کو ملکی ادب کی جانب مائل کیا۔ اقبال کا

پرچمِ اقبال اُن میدانوں میں لہرایا جو قدیم ادیبوں کی دست رس سے باہر تھے۔

لسانیات و ادبیات

حضرات! جس مراسلے نے صدر نشینی کا مژدہ مجھ کو سنایا اُس میں یہ مشورہ بھی تھا کہ مجھ کو اختیار ہوگا کہ خطبۂ صدارت میں خواہ لسانیات سے بحث کروں یا ادبیات سے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ لسانیات کے فن میں خاکسار محض کورا ہے۔ حال میں بعض رسالے پڑھے الفاظ جوڑ بند جس طرح اس فن میں جُدا کیے جاتے ہیں اُس کو دیکھ کر نگاہ میں یہ سماں پھر گیا کہ باغ میں ایک تازہ پھول دل فریب ہو۔ ہوَا اور فضا دونوں اُس کے دم سے فیض یاب ہوں۔ نباتیات کے ایک عالم تشریف فرما ہوں۔ پھول کو نگاہِ غور سے دیکھیں، چُنیں، پنکھڑیاں الگ الگ کریں۔ ہر پنکھڑی کو چیر کر اُس کی رگیں شمار کریں۔ خلاصۂ تحقیقات کا حق ادا فرمائیں، فن کو ترقی بخشیں۔ یہ جو کچھ ہوا بجا ہوا مگر پھول کی رعنائی پر تو چھُری چل گئی۔ بعینہٖ یہی عالم لسانیات کے مباحث میں نظر آیا۔ جن الفاظ کی رعنائی غالب و آتش کے یہاں "کفِ گل فروش" پر خندہ زن تھی اُن کو لسانیات کی قینچی کے نیچے اُسی طرح پارہ پارہ پایا جس طرح پھول عالمِ نباتیات کی چُٹکی میں تھا۔ حاشا اس بیان سے کسی فن کی شان میں گستاخی منظور نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اپنا اپنا ذوق ہے، اپنا اپنا مقصود۔ عطار کو گلاب کھینچ کر خوشی ہوئی کہ مریضوں کی خدمت کا سامان ہوا مگر ایک جاں سوختہ چلّا اٹھا ؎

گلوں کی کھینچ کے عطّار نے خراب کی بُو
کہاں وہ اُن کا پسینہ، کہاں گلاب کی بو

یہیں سے ہے کہ میں نے لسانیات پر ادبیات کو ترجیح دی۔

ادبِ اُردو کی اجمالی تاریخ

آغازِ بنیاد

شرفائے ادیب! ادبیات کے سلسلے میں میرا مقصد یہ نہ ہوگا کہ اُردو ادب کا تفصیلی جائزہ لوں۔ اصنافِ ادب کی ترقّی یا تنزّل پر گفتگو کروں۔ اُن کے نمونے دکھاؤں۔ فرقِ مراتب ظاہر کروں۔ اس کے لئے طویل بحث درکار ہے اور وسیع وقت۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بحث بہت کچھ ہو بھی چکی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اُن بعض مباحث پر روشنی ڈالوں جو حال میں ظہور پزیر ہوئے ہیں اور جنہوں نے ہماری زبان کی رفتارِ ترقی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اوّل تاریخِ اُردو پر اجمالی نظر مناسب ہو گی۔ اب تک عموماً اُردو زبان کا گہوارہ شاہ جہانی عہد قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ طلب مثلاً آثار الصنادید، تذکرۂ آبِ حیات، دریائے لطافت۔ جب یہ کتابیں لکھی گئیں تحقیقات کی حد یہی تھی۔ اب کہ مختلف کوششوں نے مزید راستہ صاف کیا تو دورِ شاہ جہانی سے بہت دُور سرحد نظر آنے لگی۔ چنانچہ مؤلف تذکرۂ گلِ رعنا نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اُردو زبان ہندوستان کی دیسی بولیوں اور بیرونی زبان کی آمیزش سے بنی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اور جہاں اوّل یہ میل جول ہوا وہیں اور جب ہی اُردو زبان کی بنیاد پڑی۔ یہ دیکھنے سے قبل کہ بنیاد کا آغاز کب ہوا اور کہاں ہوا یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا

کہ کیوں کر ہوا تاکہ سبب اور مسبّب کی کڑیاں باہم مل جائیں۔

حضرات! عالم میں جو عظیم الشان تغیّرات قدرت کے ہاتھوں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں وہ پیش خیمہ ہوتے ہیں بڑے بڑے انقلابوں کا۔ ملکوں اور قوموں کی نئی نئی زندگیوں کا، قسم قسم کی جدید حالتوں کا۔

برسات سے پہلے جو ہوائی طوفان مان سون کے نام سے سمندر میں برپا ہوتا ہے، وہ کیسی تازہ عظیم الشان زندگی دنیا کو بخشتا ہے۔ چٹیل میدان، ہرے بھرے کھیت بن جاتے ہیں۔ دریا موجیں مارتے ہیں۔ لوگ زحمت راحت کی تازگی سے بدل جاتی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔

اسی طرح جو تاریخی تغیّرات کرۂ زمین کے مختلف حصّوں میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں وہ انسانی زندگی میں بڑے بڑے انقلابوں کا باعث بنے ہیں۔ حکومتوں کا نقشہ بدلا ہے۔ تہذیب و تمدّن کو آگے بڑھایا ہے۔ علوم و فنون کو ترقی بخشی ہے۔ اسی سلسلے میں زبانیں بھی متأثر ہوئی ہیں۔ کبھی پیدا ہو کر بڑھی ہیں۔ کبھی مٹ کر فنا ہوئی ہیں۔ ایک بہت بڑا انقلاب جو تاریخی روشنی سے پہلے ہوا (مگر لسانیات کو ہر زبان یاد ہے) کہ وسط ایشیا سے آریا نسل کی نقل و حرکت کی صورت میں نمایاں ہوا۔ یورپ اور ایشیا کی زبانوں پر خصوصاً جو گہرے اثرات اس انقلاب کے ہوئے وہ اتنے وسیع اور دور رس تھے کہ کتابوں کی موٹی موٹی جلدوں میں بھی اُن کی تفصیل نہیں سماتی۔ زبان سے گزر کر وہ نقل و حرکت دنیا کے لئے بہت سے روحانی، سیاسی، معاشرتی وغیرہ انقلابات کا پیام تھی۔

عربی کی تاثیر

ایک اور عظیم الشان انقلاب جو تاریخ کو خوب یاد ہے وہ تھا جو تقریباً آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے جزیرہ نمائے عرب کے تپتے ریگستانوں میں رونما ہوا۔ اُس انقلاب سے مجکو یہاں صرف اُسی حد تک بحث کرنی چاہیئے جس حد تک وہ ہماری زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے اوّل اُس انقلاب نے عربی زبان کو ایّامِ جاہلیت کے محدود ادبی و خیالی دائرے سے نکال کر اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی، ملکی، علمی، اخلاقی، ادبی وغیرہ وغیرہ مطالب و مضامین کے بیان کی قوّت بخشی۔

فارسی کی تاثیر

عربی نے فارسی کو سنبھالا، توحید سے آشنا کیا، تاریخ نگاری کا سلیقہ بخشا، تصوّف سکھایا۔ ادب کا پایہ اتنا بلند کیا کہ فردوسی و سعدی آفتاب و ماہتاب بن کر نور افشاں ہوئے۔ یہی وہ دو آتشہ مئے ناب تھی جس نے ہمارے ملک ہندوستان میں بزم افروز ہوکر دیسی زبانوں کے رگ و ریشہ میں گرمیِ حیات پیدا کی۔

سندھ

اندرونی اور بیرونی بولیوں کا سب سے پہلا سنگم سندھ کا ملک ہے جہاں سنہ ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں عرب آئے۔ اُن کی زبان عربی تھی اس لئے اسی زبان کا رواج اُن کے عہد میں ہوا، اور سندھی کے دوش بدوش زبانوں پر رواں ہوئی۔ ابن حوقل نے پانچویں صدی ہجری میں عربی اور سندھی دونوں کو سندھ میں رائج پایا۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ المسالک والممالک میں کہتا ہے: ولسان اهل المنصورة والملتان ونواحيها العربية و السندية ولسان اهل المكران الفارسية والمكرانية (دیکھو ص ۲۳۲

چھاپہ لیڈن ۱۸۹۲ء)

ترجمہ:۔ منصورہ اور ملتان اور ان کے اطراف والوں کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں کی فارسی اور مکرانی۔

ظاہر ہے کہ اس میل جول کا اثر سندھی زبان پر ہوا ہوگا۔ اُس اثر میں قوت اُس اُنس اور ربط نے بخشی ہوگی جو عربوں اور سندھیوں کے درمیان اس عرصے میں پیدا ہوگیا تھا اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کی وفات کے کرج والوں نے اُس کا بُت بنا کر پرستش کی۔ شاعروں نے مرثیے لکھے[1]۔ یہی اثر اُردو زبان کا سنگ بنیاد بے خدشہ قرار پا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تحقیق کا قدم سندھ تک نہیں پہونچا۔ اس لئے اُس عہد کی نو پیدا سندھی زبان کے نمونے ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی جو کامیاب ہوئی۔ اہل نظر کی تلاش و فکر کا یہ میدان ہنوز منتظر ہے۔

پنجاب سندھ کے بعد پنجاب کا دَور تھا۔ اِن دونوں دَوروں کا مقام اجتماع قدرتی طور پر ملتان تھا۔ ظاہر ہے کہ دوسرا دور نئی زبان ہندی کا بھی یہیں شروع ہوا ہوگا۔ اگرچہ یہ دور بھی تشنۂ تحقیق ہے۔ تاہم ہم کو ممنون اور شکرگزار ہونا چاہیئے پروفیسر شیرانی کی جاں فشاں تحقیق کا جنھوں نے "پنجاب میں اُردو" لکھ کر تحقیقات کو وسعت بخشی اور بتایا کہ پنجاب نے اپنے دَور میں کیا کیا خدمتیں اُردو کی کی تھیں۔ اس جدید تحقیق سے ایک نیا باب تاریخ اُردو میں اضافہ ہوا۔ پنجاب سے سلطنت

---

[1] تاریخ ہند سید ہاشمی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ص ۱۵۳ د تاریخ سندھ مؤلفہ عبدالحلیم شرر

دلّی میں منتقل ہوئی۔ غلاموں سے لے کر مغلوں کے عہد تک اکثر دلّی ہی دارالسلطنت رہی۔ اس طویل زمانے میں نئی ہندی زبان کی پرورش وہیں ہوتی رہی۔ افسوس ہے کہ وہاں کے نشو و نما کے بھی اکثر دور پردۂ تاریکی میں ہیں۔ کاش علمی روشنی ان پردوں کو بھی چاک کر دے۔ اس اُفق پر سب سے اوّل کوکبِ خسروی بلند ہوتا ہے۔ اُن کے کلام کے جو نمونے دستیاب ہو سکے ہیں وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں ہندی زبان خاصی ترقی کر کے دوسری زبانوں سے نمایاں امتیازی خصوصیت حاصل کر چکی تھی۔ نمونۂ کلام ہے ف

زرگر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

دکن

یہی زمانہ ہے کہ علاء الدین خلجی نے انتہائے دکن تک اپنی سلطنت کا دائرہ وسیع کیا۔ یہ سیاسی اثر کی وسعت ہندی زبان کی مزید وسعت کا سبب تھی۔ خلجی کے بعد محمد شاہ تغلق نے دکن کا رُخ کیا۔ دیوگیر کو لے کر دولت آباد بنایا اور دلّی دولت آباد میں جا بسائی۔ دلّی والے اپنی زبان بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اُتر اور دکن کا یہ سیاسی تعلق بہت ہی جلد ٹوٹ گیا۔ خود محمد تغلق ہی کے عہد میں علاؤ الدین نے بہمنی سلطنت کی بنیاد جما دی۔ سیاسی تعلق کے ساتھ ساتھ دکنی ہندی کا رشتہ شمالی ہندی سے منقطع ہو گیا اور دکنی ہندی نے اپنی دکنی بہنوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کی۔ اِس وقت جو ذوق اُردو ادب کی خدمت کا حیدر آباد دکن میں پیدا ہو گیا ہے اُس کے اثر سے بہت سی کتابیں

ف "پنجاب میں اُردو" و "تاریخ اُردو قدیم"

قدیم ہندی کی دستیاب ہو چکی ہیں۔ اِن میں سب سے پہلی تصنیف اِسی دورِ بہمنی کی ہے اور وہ معراج العاشقین ہے جو نویں صدی ہجری کی تصنیف ہے یعنی آج سے پانچ سو برس پہلے کی اور جس کی نسبت قوی شہادت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہونے کی پائی جاتی ہے۔ نمونہ اُس کا یہ ہے :-

"یعنی واجب کے اُنکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے
کان سوں غیر نہ سُننا سو۔ حسد نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔
بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ لینا سو۔ کینا کی شہوت کوں
غیر جا نا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پچھان کر دوا دینا"[1]

عہد بہمنیہ سے لے کر عادل شاہی اور قطب شاہی عہد تک دکنی ہندی برابر ترقی کرتی رہی۔ سب سے اوّل نثر رائج ہوئی۔ اس کے بعد نظم۔ نظم میں سب سے پہلی کتابیں دسویں گیارہویں صدی ہجری کی دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں ملک الشعرا، نصرتی کی مثنوی گلشن ہند ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۶۸ھ میں تمام ہوئی "مبارک ہے یہ ہدیۂ نصرتی"

تاریخ تصنیف ہے۔ ڈی ٹاسی نے اگرچہ نصرتی کو برہمن لکھ دیا ہے تاہم واقعہ یہ ہے کہ وہ پشتینی مسلمان تھا اور سپاہی زادہ۔ چنانچہ خود لکھتا ہے: ؎

بحمد اللہ کہ ہیں یکر سی دری
چلے آرے ہیں بندگی میں تیری

---

[1] معراج العاشقین ص ۱ مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد دکن

یہ شعر خواجہ بندہ نواز کی منقبت میں ہے۔ نمونۂ کلام ؎

غریباں نوازندہ اے بے نیاز — یو عاجز کی سن عرض کر سرفراز
کہ عاجز ہوں ہو عاجزی پر شفیق — ہدایت کوں توفیق مجھ دے رفیق
نہ موجود ہونے کے مختار تھے — نہ اس زندگی کے ہوس دار تھے
مجھے مست کر دے محبت کا جام — کہ دنیا کا غم دل تے بسروں تمام
(مناجات گلشن عشق)

خود دکن کی مختلف سلطنتوں کے فرماں فرما ہندی میں صاحب تصنیف ہوئے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اُن کے شوق و قدردانی نے ہندی کی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں برق و باد کا کام دیا۔ قطب شاہیوں میں سلطان محمد قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ صاحب کلیات تھا۔ اُس کی کلیات کا ضخیم نسخہ (جو قطب شاہی خاندان کے شاہی کتاب خانہ کا ہے) حیدرآباد میں موجود ہے[1]۔ عادل شاہیوں میں علی عادل شاہ بھی (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) ہندی کا شاعر تھا۔ اس دور میں دکن تو ہندی زبان کی وہ خدمت کر رہا تھا جس کا مجمل بیان اوپر ہوا۔

دلّی لیکن (جہاں تک علم ہوا ہے) شمالی ہند فارسی ادب کے ذوق میں سرشار تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جس کثرت سے ایران کے اہل کمال دلّی میں آئے دکن نہ پہنچ سکے۔ اس کا سبب دربار دہلی کی قوی کشش اور قدردانی تھی۔ معہذا بمقابلہ دکن کے دلّی پہونچنا آسان

---
[1] ملاحظہ ہو رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۲ء

بھی تھا۔ یہ مانا کہ "خاکِ پاک بیجاپور" کو ملک قمی اور ظہوری پر ناز ہے
اور بجا ناز ہے ؎

گر اکسیر سرور و سور سازند
زخاکِ پاکِ بیجاپور سازند (ظہوری)

لیکن دلّی کا سرمایۂ ناز اس سے بہت بڑھا ہوا ہے۔
یہ دَور ختم ہوا تو آخر دکن ایک ہو گئے۔ شہنشاہ عالمگیر نے اورنگ آباد
کو دارالسلطنت بنایا۔ اس طرح اورنگ آباد ہی شمالی اور دکنی اہل کمال کا مرجع
بن گیا۔ اس جامعیت نے اُردو کی نشو و نما میں ابرِ بہاری کی تاثیر دکھائی۔
اورنگ آباد اور نواح اورنگ آباد کی زبان اب تک بمقابلہ دکن کے دوسرے
حصّوں کے دلّی کی زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اورنگ آباد ہی کو یہ فخر ہے
کہ اُس کی خاک سے ولی دکنی اُٹھا جس کی نظم کے سامنے ہم عصر فارسی کلام
کا رنگ ماند پڑ گیا۔ اور اُردو شاعری نے فارسی کی جگہ لے لی۔ اس کے
کیا اسباب ہوئے؟ یہاں اس کی بحث دلچسپ ہو گی۔ مغلوں نے جو قوّت
اور وسعت گاہ فنونِ لطیفہ کی تربیت و پرورش کی فیاضِ ازل کی بارگاہ سے
پائی تھی، اُس میں اب تک وہ فرد ہیں۔ اسی تربیت کے اثر سے فارسی تغزل
میں وہ لطف و رنگینی پیدا ہوئی کہ خود ایران اُس کے پیدا کرنے سے قاصر رہا۔
جو اہلِ کمال ایران سے ہندوستان میں آ کر فیض یاب ہوئے مثلاً عرفی و نظیری
اُن کے لطفِ کلام کو اُن کے وہ ایرانی معاصر نہ پا سکے جو ایران ہی میں رہے
مثلاً محتشم کاشی جس کی بے نمکی کی شکایت شیخ علی حزیں نے لکھی ہے۔ یہ تحقیق ہے

کہ عرفی و نظیری، ہندوستان آکر خان خانان اور ابوالفتح کی صحبت میں عرفی و نظیری بنے (ملاحظہ ہو دیباچۂ کلّیاتِ عرفی) بہرحال یہ دل آویز ہوش رُبا رنگ جہانگیر کے عہد تک قائم رہا اور یہ وہ رنگ تھا جس کی نسبت ع

"ورائے شاعری چیزے دگر ہست"

کہا گیا ہے۔ طالب آملی اس دور کا خاتمۃ الباب تھا۔

شاہ جہانی دور کے شعرا نے متانتِ کلام اور مثالیہ شاعری سے میدان روکا۔ کلیم اور قدسی کے دیوان شاہد ہیں۔ یہ انداز اُن پر ختم ہوگیا۔ عہدِ عالمگیری کے لئے یہ بھی باقی نہ رہا۔ محض قافیہ پیمائی رہ گئی۔ ایک شاعری پر کیا منحصر ہے، سارے فنونِ لطیفہ پر پانی پھر گیا۔ بہرحال شاعری رہی "ورائے شاعر چیزے دگر" رخصت ہوگئی۔ اس بد مذاقی کی حد جعفر زٹلی کے کلام سے جاملی جو بیّن ثبوت اس امر کا ہے کہ متین کلام میں گرمیِ سخن باقی نہ رہی تھی، اور وہ ضیافتِ طبع کا سامان بہم پہونچانے سے عاجز ہو چکا تھا۔ ہندوستان پر کیا انحصار ہے جب ایران میں صفویہ سلاطین کا ادب آموز دربار نہ رہا سنّاٹا ہو گیا۔ وہاں بھی حزیں کے بعد قاآنی کو الگ کر لو تو مشاعرے ویران نظر آئیں گے۔ نہ تیموری و صفوی رہے نہ پھر کمال پروان چڑھا۔ غرض فطرتِ انسانی ذوقِ ادب کی جویا تھی۔ ہندیوں کا فارسی کلام اس میدان میں سپر ڈال چکا تھا۔ ہندی شاعری قدم بڑھا رہی تھی۔ یہی وقت تھا کہ وَلی دکنی دلّی پہونچے۔ جہاں فارسی بے زبان تھی، وہاں اُن کی بھاشا کون سُنتا۔ اُن کی کس مپرسی دیکھ کر ایک اہلِ دل نے اُن کو یہ نکتہ بتایا کہ آتش پارسی سے

اپنے کلام کو گرماؤ تو اہلِ مذاق کی آتش شوق کو بھڑکا سکو گے۔ ولی نے اس نکتہ کو سن کر اپنے کلام کا انداز بدل دیا۔ یہ پہلا قدم تھا اُس وادیِ جنوں کی طرف جس کے مجنون میر و مرزا اور غالب و ذوق بنے۔ اس انداز نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی اُردو شاعری کو مقبولِ عام بنا دیا۔ پنجاب کا رنگ بدل جاتا ہے[1] دکن میں بادِ شمال چلنے لگتی ہے۔ بالاجی نائک ذرّہ تخلص اورنگ آبادی (معاصر میر غلام علی آزاد) کی ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ طلب ہے۔

میں غبارِ رہ دلدار ہوں اللہ اللہ	خاکِ نقشِ قدمِ یار ہوں اللہ اللہ
کیوں نہ جاناں نے میں نجیب سے چھپے مشکِ ختن	نکہتِ طرّۂ خمدار ہوں اللہ اللہ
رشک سے کیوں نہ دلِ طورِ تجلّی سے جلے	سرمۂ نرگسِ بیمار ہوں اللہ اللہ
دارِ مژگاں پہ جوں منصور انا الحق گویا	شیشۂ اشکِ پری وار ہوں اللہ اللہ
میں شہیدِ نگہِ یار ہوں اللہ اللہ	بسملِ خنجرِ دلدار ہوں اللہ اللہ
تبِ ہجرت سے بنا ہو میں رہا میں تم خوں	تشنۂ شربتِ دلدار ہوں اللہ اللہ
رُخِ دو رخسار کا عاشق ہوں ہمیشہ سیتی	زلفِ مشکیں کا میں ہار ہوں اللہ اللہ

ذرّہ خورشید لقا سیتی ہوا ہوں گلزار
سرو ہوں اور گلِ گلزار ہوں اللہ اللہ

(دیگر)

---

[1] "پنجاب میں اُردو" ص ۲۶۸

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹے روز گزر جائے گی شب بھی[1]

حاصل کلام اس ذوق نے اُردو نظم کو وہ ترقی دی کہ مرزا غالب کی نازک دماغی نے بھی (جو ہندوستان کے تمام شعراء فارسی کے باستثنا امیر خسرو منکر ہیں) اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو چیز "ورائے شاعری" ہے وہ فارسی گو ہندیوں کے یہاں معدوم ہے۔ لیکن ہندی گویوں کے یہاں ہے۔ چنانچہ چند شعر اس کے ثبوت میں لکھے ہیں جن میں ایک شعر مومن کا بھی ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پریشانی اہل کمال اس دور کے ختم ہوتے ہوتے زمانہ نے پلٹا کھایا۔ تیموری تخت پر شکست آئی۔ طوائف الملوکی کی آندھیاں چلنے لگیں۔ باغ ادب کی بلبلیں پریشان ہوئیں۔ جس طرح آندھیاں بہت سے بیج ایک جگہ سے اُڑا کر دوسری جگہ ڈال دیتی ہیں اور وہاں گلزار کھل جاتے ہیں، حوادث کی ان آندھیوں نے یہی سلوک ادب اُردو کے ساتھ کیا۔ اُردو کے اہل کمال پریشان ہو کر دلی سے نکلے تو مرشد آباد سے دکن تک پھیل گئے۔ لکھنؤ، فرخ آباد، ٹانڈہ، رام پور، پٹنہ، مرشد آباد، حیدر آباد،

---

[1] دیوان ہندی بالاجی تالک متخلص بذرہ کتاب خانہ آصفیہ نمبر ۸۵۳

کرناٹک، میسور ہر جگہ ان اُستادوں کے دم قدم سے بزمِ ادب آراستہ ہوگئی وہ خود تو برباد ہوئے مگر ادب کی انجمن آباد کر گئے۔ اہم واقعہ یہ ہے کہ اٹھارویں (۱۸) صدی میں اُردو آسام میں بھی رائج ہوگئی۔ حالانکہ انگریزی عملداری سے پہلے وہاں سیاسی خارجی اثر بہت کم کامیاب ہوسکا تھا۔[1] ستیّر کا حصّہ لکھنؤ نے پایا۔ لکھنؤ کا امن، دلّی سے قرب، سب سے زیادہ مجمع اہلِ کمال کا یہیں ہوا۔ سونے پر سہاگہ وہ تہذیب جو فرماں روایانِ اودھ اور شرفائے اودھ کی متفقہ کوشش سے پیدا ہوئی۔

اُستادی کا راز

ان اسباب نے ادب میں لکھنؤ کو دلّی کا حریف بنا دیا۔ اس پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اگلے اُستادوں نے خدمتِ فن کس طرح فرمائی۔ اوّل تو کاہش اور جاں بازی سے خود اپنی تربیت کر کے اُستادی کے مرتبہ تک پہونچے۔ صاحبِ طرز ہوئے۔ تاثیرِ کلام سے دلوں کو مسخّر کیا۔ شاگردوں کی تربیت کی اور اپنے طرزِ خاص کو رائج کیا۔ بڑا کمال یہ کہ کسی حال میں رہے (خوش حال یا بدحال) خدمتِ فن کا اہتمام جان کے ساتھ رہا۔ اِنہی بزرگوں کی کوشش سے نظمِ اُردو نے وہ مرتبہ پایا کہ اپنی مقبولیت اور کامیابی پر اُس کو بجا ناز تھا۔

نثر کی سرپرستی

نثر ہنوز سرپرستی سے محروم تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کا سامان بھی بہم پہونچ گیا۔ اٹھارویں (۱۸) صدی کے آخر میں انگریزی سلطنت کے

---

[1] Islamic culture of Hyderabad, July 1928, P. 342

استحکام اور وسعت نے کاروباری زندگی کو تازہ کیا۔ آئین کی مضبوطی نے نظام سلطنت کو از سر نو فروغ بخشا۔ ضرورت ہوئی کہ دماغ خیالی میدانوں سے نکل کر عملی زندگی کی فضا میں جوہر دکھائیں۔ ایک جانب یہ تھا۔ دوسری جانب حکومت کی ضرورتیں نئے حکام کو ملکی زبانوں کے سیکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

تدریجی رفتار دیکھو۔ ابتداءً جب کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی کے اختیارات حاصل کئے تو علمی و عدالتی زبان عربی تھی۔ عدالتی اس لحاظ سے کہ فیصلوں کا مدار عربی فقہ کی کتابوں پر تھا۔ اس ضرورت سے اوّل کمپنی نے عربی کی خدمت کی۔ ایک مدرسہ کلکتہ میں دوسرا مدراس میں قائم ہوا۔ قاضی القضاۃ، صدر الصدور، منصف و مفتی بڑے بڑے علماء وقت ہوتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں، مولانا فضل امام، قاضی القضاۃ ارتضیٰ علی خاں کے نام مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لی۔ ہدایہ وغیرہ فقہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ تعزیرات فارسی میں مدون ہوئیں۔ اُس زمانہ کے انگریز حکام فارسی کے کیسے ماہر ہوتے تھے اس کے اندازہ کے لئے یہ دلچسپ واقعہ سنو۔ ایک فوجداری کے مقدمہ میں گواہ اظہار دے رہا تھا۔ سر رشتہ دار لکھ رہا تھا۔ آلۂ ضرب کی موٹائی کے سوال میں گواہ نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا کلمے کی اُنگلی سے ملا کر بتایا کہ لکڑی اس قدر موٹی تھی۔ سر رشتہ دار کا قلم رُک گیا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا لکھوں۔ یورپین حاکم نے فوراً کہا۔ لکھو "نر انگشت را با شتابہ ضم کردہ سطبری چوب نمود"

۱۸
اس دور کے بعد اُردو کا دور تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں

فورٹ ولیم میں ادب اُردو کی ترقی و تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ ترجمہ اور تالیف کے ذریعہ سے نثر کی اکثر نظم کی کمتر کتابیں تیار کرائی گئیں۔ مشہور روزنگار ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس کے مہتمم تھے۔ ان کتابوں کی تیاری سے زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ ملکی و جنگی انگریز حکام اُن کو پڑھ کر امتحان دیں اور ہندوستانیوں کی باتیں سمجھیں۔ اس کے بعد انگریزی کے لئے میدان صاف تھا۔ یہاں یہ تذکرہ دلچسپ ہوگا کہ اُردو ادب نے دو قلعوں میں تربیت پائی۔ ایک دلّی کا قلعۂ معلّی دوسرا کلکتہ کا فورٹ ولیم۔ قلعۂ معلّی میں شاہ عالم ثانی سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ کے عہد تک کا زمانہ نیستی و بربادی کا زمانہ تھا۔ سلطنت برائے نام تھی بلکہ بدنام تھی۔ تاہم تیموریوں کا ذوق ادب اس حال میں بھی کارفرما رہا۔ قلعۂ معلّی کی زبان اُردوئے معلّی ٹھیری اور کمال کے لئے ٹکسال۔ میر تقی میر لکھتے ہیں "ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبانِ اُردوے معلّی بادشاہ ہندوستان"[1] فیض تربیت یہ تھا کہ غالب و ذوق سے اساتذہ اُسی صحبت میں بنے۔ آخر میں داغ دہلوی نے نام پایا۔ فورٹ ولیم کی تربیت نے میر امّن، سید حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس وغیرہ وغیرہ سے نثر اُردو کی قابل قدر بہت سی کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔ تاہم وہاں کے فیض تربیت سے میر امّن یا افسوس بھی نہ بچ سکے یہ بیان تشنۂ کمال رہے گا اگر اُس کوشش ادبی کا ذکر نہ کیا جائے جو سر سید اور اُن کے قابل رفقا نے ایک تیسرے قلعہ علی گڑھ کے زیر سایہ کی۔ سر سید کے قلم نے اُردو زبان کو علمی

---

[1] ذکر میر ص ٦٧

اخلاقی، سیاسی، ادبی غرض گوناگوں زندہ مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ سینٹفک سوسائٹی قائم کرکے ترجمہ کے ذریعہ سے علم و فن کے مستند سرمایہ سے گراں بار فرمایا۔ یادش بخیر اسی صحبتِ علمی کے فیض سے خواجہ حالی مرحوم نے اردو شاعری کو جدید طرز سے آشنا کیا اور مسدس حالی لکھ کر سر سید کی کوشش کو گراں بہا مدد پہونچائی۔

دہلی و لکھنؤ

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ دلی کی بربادی کے بعد ادبِ اردو کی خدمت کا سہرا لکھنؤ کے سر پر بندھا اور اربابِ ذوق نے وہ خدمت کی کہ لکھنؤ زبان کی دوسری ٹکسال قرار پایا۔[1]

حریفوں نے دلی اور لکھنؤ کو باہم خوب لڑایا ہے۔ اور بڑے بڑے معرکے گرم کئے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مرکزِ ادب گویا ان معرکوں سے بے خبر اپنے اپنے طرز پر خدمتِ ادب میں سرگرم رہے ہیں اور ایک دوسرے پر برابر اثر ڈالتا رہا ہے۔

لکھنؤ نے تہذیبِ زبان میں زیادہ حصہ لیا ہے تو دلی نے تخیلِ شعر کا علم بلند رکھا ہے۔ تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو۔ لکھنؤ میں پہلا دور تو شعرا دہلی کا تھا جن میں میر و مرزا ممتاز ہیں۔ ناسخ نے علمِ استقلال بلند کیا اور زبان کی اصلاح کی اِن کے بعد ہی مومن دہلوی کی یادگار نسیم دہلوی لکھنؤ پہونچے بزمِ استادی آراستہ کی ناسخ نے جو اصلاحِ زبان کی تھی اُس کو قبول کیا ساتھ ہی دہلوی تخیل کو قائم رکھا۔ میر حسن کے خاندان نے اپنی خاندانی خصوصیات

۱؎ دیکھو دیباچہ امیر اللغات

ادبی کو برابر قائم رکھا۔ اُن کے پوتے میر انیس اپنے مخصوص محاوروں کی بابت فرماتے "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے"[1] یہیں سے انیس و دبیر کے کلام کا فرق سمجھ سکتے ہو۔ ذرا اس پر غور کرو کہ ناسخ کے حریف آتش، دہلوی نژاد تھے۔ شاید یہی فرق ہے کہ "ورائے شاعری چیزے دگر" کی شرح میں غالب لکھتے ہیں:

"ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"[2]

سلطنت لکھنؤ کی تباہی پر نواب خلد آشیاں کے زیر سایہ رامپور میں بزم ادب آراستہ ہوئی۔ دہلی و لکھنؤ کے ارباب فن جمع ہوئے۔ اساتذۂ لکھنؤ میں سے اسیر، منیر، بحر، امیر، جلال وغیرہ جلوہ فرما ہوئے۔ دلی کا نام داغ نے روشن کیا۔ اس اجتماع سے پھر ایک کا اثر دوسرے پر ہوا۔ ان شاعروں نے اسیر جیسے پرانے استاد کے انداز کلام کو بھی اچھوتا نہ چھوڑا۔ امیر و جلال کا تو انداز ہی بدل گیا۔ دونوں استادوں کا اوّل و آخر کلام مقابلہ کر کے پڑھو تو یہ فرق صاف نظر آئے گا۔ آج لکھنؤ میں کلام غالب کا جو ذوق ہے وہ عیاں ہے، بیان کی حاجت نہیں۔ اس ربط کا دل گیر سماں یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی استادی کے آخری علم بردار داغ و امیر حیدرآباد کی ایک نامور درگاہ میں پہلو بہ پہلو آرام فرما ہیں۔

---

[1] آب حیات ذکر میر انیس مرحوم
[2] تذکرۂ گلِ رعنا حالِ آتش

ہماری زبان کے نام

یہ بحث اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت اہم ہے اس لیے اُس کا بیان میں نے ضروری خیال کیا۔

(۱) ہندی آج جو زبان اُردو کے نام سے مشہور ہے اُس کا اصلی اور مقبول عام قدیم نام "ہندی" ہے۔ یعنی جو زبان دیسی اور پردیسی زبانوں کے اختلاط و ربط سے ہندوستان میں پیدا ہوئی، اُس کا نام ہندی قرار پایا۔ اور عہد قدیم سے لے کر اب سے کچھ زمانہ پیشتر تک اُس کا یہی نام رہا۔ ذیل کی شہادتیں اس مدعا کو ثابت کریں گی۔

(۱) شیخ سعدی شیرازی نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں ترکی، گازرونی، تازی، کاشی، قزوینی، شیرازی وغیرہ زبانوں میں اشعار لکھے ہیں اُس کا مطلع ہے ؎

دلبرے دارم نکو مانندۂ شمس و قمر
دلربائے جاں فزائے قند خائے چوں شکر

اسی "دلبر" کی زبان سے مذکورۂ بالا زبانوں کے اشعار سنوائے ہیں۔ اُس میں ایک شعر ہندی بھی ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے ؏

گہ ہندی گو یدم پانی بہن روٹی کہن[1]

---

[1] کلیاتِ سعدی مطبوعہ بمبئی ۱۲۵۶ھ ص ۱۴۰

(۲) ترجمہ شمائل الاتقیاء (جو ۱۰۸۰ھ میں دکن میں ترجمہ ہوئی) "اپنی حیات[1] کے منجہ اشارات کئے تھے جو شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے"

(۳) ترجمہ معرفت السلوک۔ "کتاب معرفت السلوک جو تصنیف مغفرت پناہی ہور شیخ الشیوخ .... ہے فارسی زبانوں آسے ہندی زبانوں بیان کرے"[2]

(۴) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ زاد المتقین الی السلوک الدین مؤلفہ ۱۰۰۳ھ میں فرماتے ہیں: "و یا ہندیاں در تقریر فارسی تکلف نہ کنند و ہم بزبان ہندی اکتفا فرمایند"[3]

(۵) ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر دہلویؒ: "اس واسطے اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان ویسے ہی اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کریئے الحمدللہ والمنۃ کہ ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا ...... دوسرے یہ کہ اس میں زبانِ ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو"[4]

میر تقی میر نے نکات الشعراء میں زبانِ اردو کو ہندی لکھا ہے۔ چنانچہ آگے آتا ہے۔ انشاء اللہ خاں کے زمانہ میں اگرچہ اردو کا لفظ رائج ہو چلا تھا تاہم و

---

[1] دیباچہ ترجمہ شمائل الاتقیا نسخہ کتاب خانہ آصفیہ [2] ترجمہ معرفت السلوک نسخہ کتب خانہ آصفیہ صفحہ ۱۱۲
[3] اردو قدیم حکیم شمس اللہ قادری [4] مقدمہ ترجمہ قرآن شاہ صاحب ممدوح مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی

اس زبان کے لئے ہندی کا لفظ بھی استعمال کرتے جاتے ہیں۔ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں :

"دریں عبارت ہندی 'کل ہم تمھارے یہاں گئے تھے ۔۔۔۔

دیگر: "لو' کہ ہندی بجائے 'بگیرید' مستعمل است - علیٰ ہذا القیاس"[1]

اخیر زمانہ تک بھی یہ نام باقی رہا - چنانچہ جان گلکرسٹ نے جو بیاض اُردو شعراء کے منتخب کلام کی جمع کی تھی اُس کا نام "بیاضِ ہندی" رکھا اور ایک اور اُردو کتاب کا نام "اتالیق ہندی"[1]۔

مرزا غالب کے خطوط کے ایک مجموعے کا نام "اُردوئے معلّٰی" ہے تو دوسرے کا نام "عود ہندی"۔ یہی وجہ ہے کہ زبانِ ہندی (اُردو) کو ملکی دوسری دیسی زبانوں سے ممتاز کرنے کے لئے ایک اور لفظ "ہندوی" رائج تھا۔

آٹھویں صدی ہجری کی ایک لغت کی کتاب ہے "بحر الفضائل فی منافع الافاضل" اس میں عربی، فارسی، ترکی کے اُن الفاظ کے معنی دیسی زبان میں بھی بتائے ہیں جو اساتذہ و شعرائے فارسی کے کلام میں رائج تھے۔ صدہا جگہ دیسی زبان کے لئے "ہندوی" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً :

"خردل ۔۔۔۔۔ ہندوی رائی گویند' خرس ۔۔۔۔۔ در ہندوی ریچھ گویند۔ علیٰ ہذا القیاس"[2]

---

[1] ارباب نثر اُردو ص ۱۹، ۲۰

[2] بحر الفضائل مولفۂ محمد بن قیام بلخی نسخہ کتاب خانہ آصفیہ

فرشتہ اپنی تاریخ میں ابراہیم عادل شاہ کے ذکر میں لکھتا ہے:

"دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد۔"

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں راجہ ایابل نے عالم گیر کے رقعات مرتب کرا کر "دستور العمل کار آگہی" نام رکھا تھا۔ ۱۱۵۶ھ میں یہ مجموعہ مرتب ہوا اُس میں ایک رقعہ کی تمہید ہے:

"درآیا ہے کہ شجاع بدفعہ اول درمقابلۂ عالم گیر بادشاہ ہزیمت خوردہ فرار نمود ۔۔۔۔۔۔ واز اتفاقات درآں ایام نوشتہ خط ہندوی اعلیٰ حضرت کہ بنام شجاع فرستادہ بدست آمدہ بود۔"

اور رقعۂ مذکور کی عبارت یہ ہے:

"عرضی ۔۔۔۔۔ از سبب گرفت دیگر خطوط استفسار شدہ بود ۔۔۔
چنانچہ از نوشتہ کہ بخط ہندوی لشجاع قلمی گردیدہ بود۔"

(۳) **ریختہ** یہ نام بمقابلۂ "ہندی" کے بہت جدید ہے۔ اور بظاہر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں بارہویں صدی ہجری کے وسط میں رائج ہوا۔ ولی دکنی کا شعر ہے ؎

"یہ ریختہ ولی کا جا کر اُسے سنا دو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند"

یہ لحاظ رہے کہ ریختہ دراصل نظم اُردو کا نام تھا اور زیادہ تر اُسی زبان کے لئے استعمال ہوا جو نظم کی یا شعر کی تھی، زیادہ عام کہو تو فصحا کی چنانچہ میر تقی میر نکات الشعراء کے خاتمے پر لکھتے ہیں:

"بدانکہ ریختہ بر چندین قسم ست"

اس کے بعد یہ چھ قسمیں لکھی ہیں :

(۱) ایک مصرعہ فارسی دوسرا ہندی (۲) نصف مصرعہ ہندی اور نصف فارسی
(۳) حرف وفعل فارسی استعمال کریں (۴) فارسی ترکیبیں مستعمل ہوں
(۵) ایہام (۶) انداز جو میر صاحب کا مختار ہے جس میں ادا بندی فصاحت و بلاغت شامل ہے۔

محمد قیام الدین قائم۔ اپنے تذکرہ مخزن نکات میں کہتے ہیں کہ :

"ذکر د بیانِ اشعار و احوالِ شعرائے ریختہ"

شاہ عبدالقادر صاحب کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی وہ بھی یہ امتیاز ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعرہ کے مقابل میں (جو اس عہد میں فارسی کلام کے لئے ہوتا تھا) "مراختہ" کا لفظ ایجاد ہوا۔ حاکم لاہوری اپنے تذکرہ "مردم دیدہ" میں خان آرزو کے حال میں لکھتے ہیں :

"مراختہ در خانۂ خانِ آرزو پانزدہم ہر ماہے می باشد"

خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے :

"باشعر ربط بسیار دارد سیما ریختہ کہ الحال در ہندوستان رواج دارد"

(۳) اُردو سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ ترکی ہے لشکر کے معنی ہیں۔ ابتداءً مغل اور ترک بادشاہ لشکر ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے دربار و سراپردہ بھی لشکر ہی میں ہوتا تھا۔ اس اعتبار خاص سے شاہی لشکر

"اُردوئے معلّٰی" کہلایا اور بارگاہ وسرا پردہ کا نام "اُردوے معلّٰی" ہوا۔ یہ تو عام بات ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ لفظ ہماری زبان کے لئے بجائے "ہندی" اور "ریختہ" کے کب سے رائج ہوا۔ جن مورخین اُردو نے عہد شاہجہانی کو اُردو کے نشو ونما کا عہد قرار دیا ہے وہ شاہجہاں کے اُردوے معلّٰی[1] کی مناسبت سے اس کا اُردو نام رکھا جانا تجویز فرماتے ہیں مگر اس کی کوئی سند نہیں کہ عہد مذکور میں اس زبان کا نام اُردو تھا۔ انتہا یہ کہ دلّی کے اُردو بازار کا نام بھی اُس عہد میں یہ نہ تھا[2]۔ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے کہ ابتدا سے آخر تک ہماری زبان کا نام ہندی رہا۔ جب ولی دکنی نے مضامین فارسی کی چاشنی ہندی نظم میں پیدا کی تو خاص ادبی و شعری زبان کو ریختہ کہنے لگے۔ اُس وقت تک بھی اُردو کا لفظ اس زبان کے لئے مستعمل نہ ہوا تھا۔ چنانچہ میرتقی میرؔ، میر حسن دہلوی، قیام الدین قائمؔ نے اپنے اپنے تذکروں میں کلام اُردو کے لیے ریختہ ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُردو کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ ذکر میرؔ اور تذکرہ نکات الشعرا میں میر صاحب لکھتے ہیں۔

> "در فنِ ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبانِ اُردوئے معلّٰی شاہجہاں آباد دہلی" (دیباچہ نکات الشعرا)

> "ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبان اُردوے معلّٰی بادشاہ ہندوستان" (ذکر میر)

---

[1] آثار الصنادید [2] ایضاً بحوالہ تاریخ مرأت آفتاب نما

کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ اُردو کا مولد و ماویٰ دربار تھا نہ بازار اور اُردو اُ۔دو بازار سے نہیں نکلی بلکہ اُردو بازار اُردو کے لئے بنایا گیا ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کی دھاک ایک عالم میں بیٹھی ہوئی تھی قیاس ہے کہ اسی اثر سے یہ لفظ روس کے ملک میں پہونچا "اُوردا" (Orda) کے روپ میں وہاں سے یورپ میں آیا اور "ہورڈ" (Hoard) بن گیا۔ دریائے والگا کے کنارے سرائے (ملک روس) میں یا تو خاندان کی محلسرا اردوے مطلّا کہلاتی تھی (Golden Ordu) تاش قند اور خوقند میں اب اُردو قلعہ کے معنی میں مستعمل ہے[1]۔ اِسی لئے دلّی کا قلعہ اُردوے معلّٰی کہلایا ہوگا۔ اگرچہ دلّی میں سلطنت کی ابتدا غلاموں سے ہوئی اور عرصہ تک قائم رہی۔ یہ غلام ڈال سے لوٹے ہوئے ترک تھے۔ تاہم اُردو کا لفظ اپنے لغوی معنی میں مغلوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں رائج نہیں ہوا۔ جہاں تک عہد بالا کے متعلق کتابیں دیکھی گئیں یہ لفظ نظر سے نہیں گزرا۔ انتہا یہ کہ مذکورۂ بالا کتاب بحر الفضائل نے وہ ترکی الفاظ بھی لکھے ہیں جو اساتذہ کے کلام میں مروج تھے مگر اس نے بھی اُردو کا لفظ نہیں لکھا۔ حالانکہ باب الف میں دوسرے ترکی الفاظ مذکور ہیں۔ اُردوے قدیم کے مؤلف نے مؤید الفضلا کے حوالہ سے سکندر لودی کے عہد میں اس کا

---

[1] Hobson Jobson by col Henry Yule A.C. Burnell. London 1903 pp. 639, 640.

[2] رسالہ اردوے قدیم ص ۳

استعمال بتایا ہے۔ مگر پروفیسر شیرانی نے اس کو مجروح کر دیا ہے۔ قطعی طور پر "اس لفظ کا استعمال عہد بابری سے پایا جاتا ہے"۔[1] اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک "اردوے معلیٰ" قلعۂ شاہی کے واسطے مخصوص تھا۔ زبان کے لیئے عام طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دیکھو سودا کے حال میں میر صاحب فرماتے ہیں :

"سرآمد شعراے ہندی اوست (نکات الشعراء)

سرآمد شعراے اردو نہیں فرماتے۔ اسی بیان میں فرماتے ہیں :

"شاعر ریختہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید"۔

یہاں بھی ملک الشعراء اردو نہیں۔ خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے :

"مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است"۔

میر سجاد "شاعر خوب ریختہ"۔ فغاں "شعر ریختہ خوب می گوید"۔

پاک باز "در جمع شاعرانِ ریختہ"۔ ولی "در ریختہ خود بکار برد"۔

سید عبد الوالی "میدانِ ریختہ"

غرض ہر جگہ ریختہ ہی ریختہ ہے اردو کہیں نہیں۔[2] میر حسن کا تذکرہ :

"تذکرۂ سخن آفرینانِ ہندی زبان"۔ "اول ریختہ از زبانِ دکھن رواج یافتہ"۔ (احوال متقدمین) احمد گجراتی کے حال میں "در زبان سنسکرت و بھاکا می گویند کہ تصانیف بسیار دارد" ---------

---

[1] رسالہ اردوے قدیم صہ ۳ [2] نکات الشعرا

"دہ سہ ریختہ ہم گفتہ"۔ میر محمد حسن کلیم ----- "ترجمہ فصوص در زبان ریختہ کردہ۔ کتابے در نثر ہندی نثرا ایجاد نمودہ چنانچہ یک فقرہ بیاد ماندہ قلمی می نماید --------- کل کے دن تھے باوشاہ وزیر۔ آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے بھیر۔ ایسی دولت سے زنہار ------ فاعتبروا یا اولی الابصار"۔
غرض ہر جگہ یہاں بھی ریختہ ہی ریختہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قیام الدین قائم کے تذکرہ میں۔

بعض اہل الرائے کا قول ہے (اور مجکو اس سے اتفاق ہے) کہ عام طور پر لفظ اُردو زبان کے لئے رفتہ رفتہ اٹھارویں صدی کے آخر میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ عہد شجاع الدولہ و آصف الدولہ میں سید عطا حسین نے "نوطرز مرصع" تالیف کی۔ اس میں ایک ہی صفحہ میں اپنی زبان کے لئے "ریختہ" "ہندی" "زبان اُردوے معلّٰی" استعمال کرتے ہیں۔ خالی 'زبان اُردو' یا 'اُردو' وہاں بھی نظر سے نہیں گزری۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ محض لفظ اُردو زبان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ مصحفی ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس مُنھ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

"قواعد زبان اُردو" (دریائے لطافت انشا، دیباچہ)۔ داغ ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے[1]

---

[1] نور اللغات و امیر اللغات

یہ بحث کہ ہندی کی جگہ پر اُردو نے کیوں قبضہ کیا، آگے ملاحظہ ہو۔

(۴) **ہندوستانی** | چوتھا نام ہماری زبان کا "ہندوستانی" ہے اور یہ خالص یورپین پیداوار ہے۔ اس نام میں خاص غور کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ بعض پیچیدہ مسائل اسی کے استعمال سے پیدا ہو گئے ہیں۔

سب سے پہلے پرتگیزوں نے سترہویں صدی عیسوی میں ہماری زبان کا نام "انڈوسٹان" (Indostan) رکھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان مور کہلاتے تھے۔ اسی صدی میں زبان کو 'انڈوسٹانی' بھی بول جاتے تھے اور بھی کہدیتے تھے۔ ۱۶۹۷ء میں ہندوستانی زبان (Hindostani language) کا لفظ پایا جاتا ہے۔ ۱۷۲۶ء میں ایک مورخ لکھتا ہے "یہاں کی (ہندوستانی) زبان 'ہندسٹانڈ' (Hindostand) یا 'مورز' ہے۔"

اٹھارویں (۱۸) صدی تک عام طور پر ہندی زبان کا نام 'مور' رہا۔ جیسا کہ ٹامل کا "ملابار" اور بنگالی کا "بنگال"۔ اُردو کو اسی طرح 'انڈوسٹان' کہتے تھے۔ اور یہ بھی سن لو کہ شاہی فوج کے افسر اس نیک بخت کو کالی زبان (Black language) کہتے تھے۔ سیاہ تاو تو سُنا ہوگا، سیاہ زبان بھی سُن لو۔ ہندوستانی کے معنی بھی سُننے کے قابل ہیں:

"ہندوستانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس ملک کی زبان ہے مگر فی الحقیقت بالائے ہند کے محمدیوں کی زبان، اور بالآخر دکن کے محمدیوں کی زبان جو سیاں و آب

کی ہندی بولی سے خصوصاً اور اُس حصۂ ملک کی بولی سے جو آگرہ و دہلی کے نواح میں ہے فارسی الفاظ و جملوں کی آمیزش سے بنی ہے اور جو دوسرے غیر ملکی الفاظ کے قبول کرنے کو بھی تیار ہے۔ اس کا نام اُردو بھی ہے یہ زبان عرصہ دراز تک مسلمانوں کی زبانِ عام (Lingua franca) تمام ہندوستان میں خصوصاً رہی اور اب بھی اُس کو یہ امتیاز ملک کے بڑے حصے اور خاص جماعتوں میں حاصل ہے۔ اولڈ فیشن کے اینگلو انڈین اس کو مورز کہتے تھے۔" [1]

اب ہندی کے معنی سنو:

"بہت ہی عام طور پر یورپین ہندوستان کی اُن زبانوں کو کہتے ہیں جو فارسی محاورات سے بمقابلہ ہندوستانی کے کمتر متغیر ہوئی ہیں جو خصوصاً ممالک مغربی و شمالی (اب صوبجات متحدہ شروانی) کے دیہاتی رقبے میں اور اُن کے سرحدی مقاموں میں بولی جاتی ہیں۔ ہندی کا سب سے قدیم کلام "چاند بردائی" کی مشہور نظم ہے"

گرائرسن نے اپنی کتاب میں جس کا نام "ہندوستان کا موجودہ دیسی ادب" ہے۔ تین زبانوں سے بحث کی ہے۔ مارواڑی، ہندی اور بہاری۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ:

"یہ زبانیں، ہندوستان کی ہیں جس سے مراد راجپوتانہ، میان دوآب

---

[1] Hobson Jobson pp. 415, 417, 418, 504, 639, 640

جمنا و گنگا کنارۂ دریا سے کوسی تک ہے"۔

یہ بھی لکھا ہے کہ:

"میں نے پردیسی ادبی اُردو کو خارج از بحث رکھا ہے"۔

اسی مستند ماہر زبان کا ایک اور فقرہ قابل غور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"انیسویں صدی کا نصف اوّل جو مرہٹوں کی حکومت سے لے کر غدر کے زمانہ تک رہا۔ ایک ممیز عہد ہے۔ گزشتہ صدی کی ادبی تباہی کے بعد یہ ترقی اور تجدّد کا دَور تھا۔ شمالی ہند میں اسی زمانے میں عملاً مطبع کا ظہور ہوا۔ اور تلسی داس کی روح کی رہنمائی سے صحیح قسم کا ادب عجب سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا۔ یہ زمانہ ہندی زبان کی پیدائش کا تھا جو انگریزوں کی ایجاد تھی جس کا پہلا استعمال تالیف نثر میں گلکرسٹ کی زیر تعلیم سنہ ۱۸۰۳ء میں للوجی لال نے کیا جو پریم ساگر کے مؤلف تھے"۔

اِس بحث کی مناسبت سے فورٹ ولیم کی خدمات ادبی پر پھر ایک نظر ڈالنی مناسب ہے۔ اٹھارویں[18] صدی کے خاتمے پر لارڈ ولزلی کے عہد میں فورٹ ولیم کالج سرکاری افسروں کو یورپین اور دیسی زبانوں کی تعلیم دینے کے واسطے قائم ہوا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اُس کے صدر مقرر ہوئے۔ جن کی سرپرستی میں بہت سی اُردو کتابیں لکھی گئیں اِسی دور میں اُردو کے لئے ہندوستانی کا لفظ سندی

Grierson's The Modern Vernacular Literature. PR VIII & XXI ۱۰

ہوگیا۔ چنانچہ جان گلکرسٹ نے اپنی مشہور "انگریزی ہندوستانی" ڈکشنری لکھی جو کلکتہ سے ۱۷۹۲ء میں شائع ہوئی۔ علیٰ ہذا القیاس "ہندوستانی عام اللسان"۔[۵۱]

میرامن باغ و بہار میں لکھتے ہیں:

"جان گلکرسٹ صاحب نے ۔۔۔۔۔ فرمایا کہ قصّے کو ایسی ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان۔ عورت مرد۔ لڑکے بالے خاص عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ۔۔۔۔۔"

فورٹ ولیم کی سرپرستی کی جہاں اُردو نثر ممنون ہے وہاں للو جی لال کی تصانیف بھی ہیں جن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ:

"انھوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے زبان اور طرز بیان کا ایسا پسندیدہ نمونہ پیش کیا کہ متاخر ہندی اہل قلم نے اسی پر اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں (للو جی لال اور سدل مسرا) نے اس زمانہ کے عام اُردو مؤلفین کے برخلاف اُردو تحریر سے عربی فارسی کے ثقیل اور غیرمانوس الفاظ نکال کر سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے زیادہ سلیس اور عام فہم الفاظ داخل کیے اور اپنی کتابیں دیوناگری رسم خط میں لکھ کر ہندی نثر نویسی کے اعلیٰ نمونے قوم کے آگے پیش کیے۔"[۵۲]

گرائرسن کی شہادت ملاحظہ ہو:

"۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ کی زیر تعلیم للو جی لال نے مخلوط اُردو میں

---

۵۱ ارباب نثر اُردو ص ۱۰۲ ۵۲ ارباب نثر اُردو ص ۲۵۱

(جو اکبر کے لشکری شاگرد پیشہ کی اور بازار کی جہاں تمام قوموں کے
آدمی جمع ہوتے تھے) زبان تھی۔ پریم ساگر لکھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی
کہ مولف نے اسم اور حروف ربط ہندی الاصل بجائے عربی و فارسی الاصل
کے استعمال کئے۔ اس کا نتیجہ عملاً ایک نوایجاد بول ہوئی جس کی گرامر اگرچہ
نمونۂ سابق کے مطابق تھی مگر محاورہ بالکل بدل گیا۔ یہ نئی زبان جس کو
یورپین ہندی کہتے ہیں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک بطور ہندؤں کی زبان عام (لنگوا فرنیکا) کے اختیار کرلی گئی
اور اس کی ضرورت تھی جو پوری ہوگئی۔ یہ زبان مسلمہ ذریعہ ادبی نثر کا تمام
شمالی ہند میں بن چکی ہے۔ اگرچہ بوجہ اس کے کہ وہ کہیں کی بولی نہیں
نظم نگاری میں کام نہیں آئی اگرچہ بڑی سے بڑی ذہانت نے اس کی
کوشش کرلی ہے مگر کامیاب نہ ہوتی۔ لہذا شمالی ہند میں آج کل ادب کا
یہ لاثانی عالم نظر آتا ہے کہ اُس کی نظم ہر جگہ مقامی بولیوں میں لکھی جاتی ہے۔
خصوصاً برج بیسواڑی۔ اور بہاری میں اور اُس کی نثر ایک یکساں
مصنوعی بولی میں جو کسی ہندی نژاد کی مادری زبان نہیں اور جس کو
اُس کے ایجاد کنندوں کی سرپرستی نے بزور منوالیا۔ اس لئے کہ اُس میں
ابتداءً جو کتابیں لکھی گئیں وہ نہایت عام پسند حیثیت کی تھیں اور
اس وجہ سے کہ اُس نے ایسا میدان پالیا جس میں وہ علانیہ طور پر
مفید ثابت ہوئی"[1]

---

[1] Grierson's Modern Vernacular literature of Hindustani. ch. X P. 107.

ڈی ٹاسی کے بیان پر بھی ایک نظر مناسب ہے۔ یہ مشہور فرانسیسی مصنف ادبی بیان میں مؤلفین و شعراء کے مذہب کا تعین ضروری سمجھتا ہے۔ سنّی شیعہ کی تصریح کرتا ہے۔ نصرتی کو برہمن بنا دیتا ہے۔ زبان کی تقسیم بھی اسلامی اور ہندوی کرتا ہے۔ اپنے خطبہ دوم (۱۸۵۱ء) میں کہتا ہے:

"ہندوستانی زبان کی ہندوی اور اسلامی شاخوں کا علم ادب صرف کثیر ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا بھی ہے۔ سنسکرت کے فریق سے (جن کی زبان ہندو ہندوستانی ہے) ہمیں شکنتلا کا قصہ ملے گا۔ فارسی کا فریق (جن کی زبان اسلامی ہندوستانی ہے) ولی کا دیوان پیش کرے گا۔ اب رہا خالص ہندوستانی فریق اس سے ایک کتاب "مہر و ماہ" آپ کو سناؤں گا جس طرح ہندوستانی لکھنے کے دو طریقے ہیں ایک فارسی حروف مسلمان ہندوستانی کے لئے۔ دوسرا دیوناگری ہیں ہندو ہندوستانی کے لئے۔ ہندوی اور مسلمانی دونوں شاخوں میں نظم مقفّیٰ ہوتی ہے۔

ایک قصہ نظم میں جس کا نام "سخت جگر" ہے یال مکند سکندرآباد کے رہنے والے نے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ شخص ہندو ہے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مگر اس نے یہ تصنیف اُردو ہی میں کی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اُردو شمال میں مسلمانوں کی ہندوستانی ہے۔"

یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ کیا سکندرہ آباد نواحِ دہلی میں بھی ہندو مسلمانوں کی بولی جدا جدا تھی؟

تیسرا لیکچر ۵ دسمبر ۱۸۵۲ء:

"ہندوستانی اہل ہند کی زبان ہے۔ مگر یہ زبان اپنے حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے۔ خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نمائے ہندوستان میں، نیز ایران، تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں۔ اہل یورپ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے ہندوی بہتر ہے۔ اور مسلمانوں کی بولی کے لئے ہندوستانی کا نام قرار دے لیا ہے اور شمال کے مسلمانوں کی زبان (یعنی ہندوستانی اُردو) ممالک مغربی و شمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔ ہندوستانی زبان یا ہندوستانی (یعنی ہندوستان کی زبان) کی یہ تفریق (یعنی ہندی اور اُردو) مذہب نے پیدا کی ہے۔ اور اس لئے عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی اور اُردو مسلمانوں کی زبان ہے"[1]

فورٹ ولیم کالج اور دیگر یورپین ادبی سرگرمیوں کا من جملہ بہت سے نتائج کے جو ایک نتیجہ زبان کی تفریق کا پیدا ہوا اس کا قصہ ستارۂ ہند راجہ شیو پرشاد کے قلم کے زبانی سنئیے۔ راجہ صاحب کی نسبت گرائرسن نے لکھا ہے:

"وہ اپنی اس کوشش کے لئے مشہور رہیں کہ ہندوستانی زبان کے ایک ایسے طرز کو عام فہم بنا دیں جس کو وہ آگرہ، دلی اور لکھنؤ یا خاص ہندوستان کی عام بولی کہتے ہیں جو فارسی سے گراں بار اُردو اور سنسکرت سے گراں بار ہندی کے درمیان میں ہے۔ اس کوشش نے ایک گرما گرم

---

[1] رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۸ء ترجمہ خطبہائے ڈی تاسی مترجمہ نواب مسعود جنگ بہادر

اور ہنوز غیر منفصل مباحثہ باشندگان ہند کے درمیان پیدا کر دیا ہے"[1]
غرض راجہ صاحب لکھتے ہیں:

"یہ عجیب غریب بات ہے کہ ہماری دیسی زبان متواتر ایسے دو خطوں میں لازماً لکھی جائے جیسے فارسی اور ناگری ہیں۔ ایک سیدھی طرف سے لکھا جاتا ہے دوسرا اُلٹی طرف سے۔ لیکن یہ بالکل انوکھی بات ہے کہ اُس کی گریمریں بھی دو ہوں۔ یہ حماقت ڈاکٹر گلکرسٹ کے وقت کے پنڈتوں اور مولویوں کی بدولت وجود میں آئی۔ وہ مامور تو اس امر پر تھے کہ باشندگان ہند کی عام زبان کی ایک عام صرف و نحو بنائیں۔ مگر اُنھوں نے دو گریمریں بنا دیں ایک خالص فارسی عربی کی دوسری خالص سنسکرت اور پراکرت کی۔ مولوی سنسکرت سے ناواقف تھے اور اُنھوں نے یہ بات نظر انداز کی کہ ہماری زبان کی بنیاد آرین ہے۔ اسی طرح پنڈت سامی اثرات مابعد کے قبول کرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ یہاں سے وہ اُردوے فارسی نکلی جو سرکاری دفتروں میں ہے جس کو عام آبادی نہیں سمجھ سکتی ہے۔ اسی طرح پریم ساگر کی خالص ہندی نا قابل فہم ہے۔ ایک تو قومیت سے اس قدر عاری ہے کہ مقبول عام نہیں ہو سکتی دوسری طفلانہ انداز میں اُن واقعات سے انکار کرتی ہے جن کے اثر سے اُردو ایک زبان بن گئی۔ نتیجہ بد اس کا یہ ہے کہ بجاے عام دیسی زبان کی اسکول گریمر بنانے کے یا بالفاظ دیگر ایک

---

[1] Griersons M. V L. p. 14 8

ایسی عام گریمر کے جو فارسی اور ناگری دونوں حرفوں میں بے کھٹکے لکھی جائے .... ہمارے یہاں دو متضاد اور مخالف جماعت کی کتابیں ہیں ایک مسلمان اور کالیستھوں کے لئے، دوسرے برہمنوں اور بنیوں کے لئے"۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"نادان مولویوں اور پنڈت دونوں کی یہ بڑی بھول ہے کہ ایک تو سوائے فعل اور حرفوں کے باقی سب الفاظ صحیح فارسی عربی کے کام میں لانا چاہتے ہیں اور دوسرے صحیح پانن کی ٹکسال کی کھری کھرّی سنسکرت گویا یہ جو ہزاروں برس سے ہم ہی لوگ ہزاروں حالتوں کے سبب سے ہزاروں ردّ و بدل اپنی بولی میں کرتے چلے آئے ہیں وہ اُن کے رتی بھر بھی لحاظ کے قابل نہیں بلکہ اس دستور کی جسے ایک طبعی قانون کہنا چاہیئے اُن کے آگے کچھ گنتی ہی نہیں۔ سخت مشکل سنسکرت لفظوں کو جو ہزاروں برس دانت ہونٹھ جیبھ سے ٹکراتے ٹکراتے گول مٹول پہاڑی ندی کی بٹیا بن گئے ہیں۔ پنڈت جی پھر ویسے ہی کھردرے سنگھاڑے کی طرح نکیلے پتھر کے ڈھوکے بنانا چاہتے ہیں جیسے وے ندی میں پڑنے سے پہلے پہاڑ سے ٹوٹنے کے وقت رہتے ہیں اور مولوی صاحب اپنے عین قاف کام میں لانا چاہتے ہیں کہ بے چارے لڑکے بلبلاتے بلبلاتے اونٹ ہی بن جاتے ہیں۔

---

[1] اردو صرف و نحو کا انگریزی دیباچہ مطبع سرکاری الہ آباد ۱۸۷۵ء مولفہ راجہ شیو پرشاد

پر تماشا یہ ہو کہ ادھر تو مولوی صاحب یا پنڈت جی ایک لفظ صحیح کرنے میں یا پردیسی ہونے کے قصور میں اسے کالے پانی جانے کا حکم دیتے ہیں اور اُدھر تب تک لوگ سو لفظوں کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس دیس کی بولی کا فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی لفظوں سے خالی کرنے کی کوشش ویسی ہی ہو جیسے کوئی انگریزی کو یونانی، رومی، فرانسیسی، الیمانی وغیرہ پردیسی لفظوں سے خالی کرنا چاہے۔ جیسے وہ ہزاروں برس پہلے بولی جاتی تھی اُس کے اب بولنے کی تدبیر کرے۔"[1]

ایک اور ماہر زبان کی رائے سنا کر اس داستان کو ختم کرتا ہوں:

"تمام تر کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ملک کی زبان اُردو رہے۔ یعنی تیس چالیس برس اُدھر کی اُردو جس کی بنیاد ہندی ہو۔ بیرونی الفاظ کی بے تکلف آمیزش کے ساتھ، کیوں کہ یہی وہ شکل ہو جس میں وہ خود بخود متشکل ہوئی ہو۔ اُس کے رنگ برنگ ہونے کو برداشت کرنا بلکہ سراہنا چاہیئے۔ درآں حالے کہ مصنوعی یکسانیت ناکامی کے مرادف ہوگی....

...... بہت تھوڑا زمانہ گزرا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی زبان کا ایک ہی روزمرّہ تھا۔ اگرچہ ہندو ابتدائی مناسبت اور شاید ایسے مضامین کی قدرتی نوعیت کی وجہ سے بھی جن کا تعلق دیومالا سے ہو فطرۃً (لیکن نہ لازم یا متناسب طور پر) زیادہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے

---

[1] تحریر زبان اُردو صرف و نحو مذکورۂ بالا

اور مسلمان اپنی مذہبی نوعیت سے زیادہ فارسی کے الفاظ - ایسے عین
وقت ہو کہ یہ خیالی امتیاز پھر وحدت میں ڈبو دیا جائے اور ملک کی
زبانِ عام تناسب کے مطابق ہندوستانی کے نام سے مشہور ہو لے"
ان مباحث کے مختلف پہلوؤں پر اور اُن کے آثار ونتائج پر غور و تامل بمقابلہ
کسی طویل لفظی بحث کے زیادہ مناسب اور نتیجہ خیز ہوگا -

موجودہ ادبی اور علمی ادارات

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا اُس کا تعلق اُردو کے دورِ ماضی سے تھا
اس حصہ میں ہم بعض دورِ حاضرہ کے عظیم الشان اُردو کے کارناموں پر روشنی
ڈالنی چاہتے ہیں -

(۱) سینٹفک سوسئٹی اس سلسلے میں سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے ایک منظم
اور باقاعدہ کوشش سینٹفک سوسائٹی قائم کرکے فرمائی
یہ سوسئٹی بمقام غازی پور ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی " ڈیوک آو آرگائل وزیر
ہند اس کے مربّی (پیٹرن) تھے اور ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب کے
لفٹنٹ گورنر نائب مربّی اور دُور دراز صوبوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزت

" Some objections to The Modern Style of Official Hindustani" by F. S. Growse, M. A. Oxon, B. S. C.

ہندو مسلمان ارکان" اس سوسیٹی نے قریب چالیس[۴۰] کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں (حیات جاوید[۲۶] حصہ صفحہ) غازی پور سے اس کا مستقر سرسید کے ساتھ علی گڑھ کو تبدیل ہوا۔

(۲) انجمن ترقی اُردو | اس انجمن کا اصل مقصد یہ ہے کہ " زبان اُردو کو مشرقی و مغربی علوم و فنون سے بذریعہ ترجمہ و تالیف مالا مال کیا جائے " یہ انجمن بھی ایک باضابطہ مجلس کے زیرِ نگرانی کام کر رہی ہے۔ جس کے صدر سر سید کے نامور پوتے نواب مسعود جنگ بہادر ہیں۔ ارکان میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو جیسے ادب دوست بھی شامل ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلے سکرٹری علامہ شبلی مرحوم تھے۔ اب ملک کے مشہور محقق ادیب مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ چند روز مولوی عزیز مرزا مرحوم نے بھی اس خدمت کا سرانجام کیا تھا۔ ۱۹۱۳ء سے اورنگ آباد (ریاست حیدر آباد) اس مجلس کا مستقر ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل علوم و فنون کی کتابیں انجمن شائع کر چکی ہے۔

(۱) شعر و سخن ۸ (۲) قواعد و زبان و لغت ۷

(۳) تعلیم و تربیت ۴ (۴) تاریخ و سیر ۱۰ ، سائنس ۲

فلسفہ ۴ ، اقتصادیات ایک ، مذہب ایک۔ جملہ چالیس[۴۰]

اس وقت انجمن علاوہ اور تالیفات کے ان متعدد لغتوں کی تیاری میں مصروف ہے:

(الف) انگریزی سے اُردو۔ یہ مبسوط اور مکمل لغت ہوگی۔ اس کی تیاری میں مختلف انگریزی لغات سے مدد لی گئی ہے تکمیل ہو چکی۔ طباعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔

(ب) پیشہ وروں کے اصطلاحات کی لغت - یہ بھی تیار ہے - صرف تصویروں اور نقشوں کی تکمیل باقی ہے۔

(ج) لغت زبانِ اُردو۔

(د) لغت زبان دکنی -

کتابوں کے علاوہ دو سہ ماہی رسالے بھی انجمن شائع کرتی ہے۔

اوّل - اُردو - جو بہترین اُردو ادبی رسالہ کہا جا سکتا ہے جس کے مضامین نے اُردو ادب کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔

دوم - سائنس - اس میں خالص سائنس کے مضامین ہوتے ہیں مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل و خیالات اُردو داں پبلک میں مقبول بنائے جائیں۔ انجمن ملک کے اُردو کتاب خانوں کی کتابوں سے مدد کرتی ہے - انجمن کی شاخیں (یعنی کتاب خانے) سارے ملک میں قائم ہیں جن کی تعداد اس وقت ۹۶ ہے۔

(۳) دار المصنفین اعظم گڑھ

زمانۂ حال میں تعلیمی اور علمی اُردو ادب کی اشاعت کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں یہ مجلس ممتاز شان رکھتی ہے۔ یہ مجلس علاّمہ شبلی مرحوم کے "خیال" کی تعمیل ہے۔ علاّمہ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کے خاص تلامذہ اور احباب نے ۱۹۱۵ء میں اس کی بنیاد ڈالی خود علاّمہ مرحوم نے گوشہ نشین اعظم گڑھ کو اس مجلس کا مقام تجویز کر کے اپنے دو بنگلے وقف کر دیئے تھے۔ دار المصنفین ایک مجلس کے تحت انتظام ہے جس کے ارکان ملک کے ایسے علم دوست افراد ہیں جن کو علم کا صحیح ذوق ہے۔ نواب عماد الملک بلگرامی مرحوم اپنی حیات تک صدر نشین رہے

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی ناظم ہیں اور مولوی مسعود علی صاحب مہتمم۔
یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی دونوں روح رواں ہیں۔ عربی، اُردو، انگریزی
کتابوں کا وسیع کتاب خانہ ہے، پریس ہے اور ان سب ضرورتوں کے واسطے
دارالمصنفین کی خود اپنی پختہ عمارتیں ہیں۔ اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں
اُن کی تعداد تیس (۳۰) سے زیادہ ہے اور باعتبار تقسیم علوم۔ سیرۃ، فلسفہ، تاریخ علوم
تاریخ و آثار اور ادبیات کی ہیں۔ معارف نامی رسالہ ماہوار شائع ہوتا ہے جو
باعتبار خوبی مضامین کے بہترین رسالوں میں شمار ہو سکتا ہے اور جس نے علمی مضامین
کا باوقار نمونہ اُردو میں پیش کیا ہے۔ آمدنی کا بڑا حصّہ مستقل ہے۔ گزشتہ سال
باون ہزار سے زاید کی آمدنی تھی۔ رفقا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود
اعظم گڑھ میں قیام کرکے تصنیف و تالیف میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے
قیام کے واسطے دارالمصنفین کی عمارت میں۔ مکانات مہیّا ہیں۔ دوسرے وہ
علما ہیں جو باہر رہ کر اپنی تصانیف سے دارالمصنفین کو فیض یاب فرماتے رہتے
ہیں۔ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے بعض بہترین دماغ اس علمی مجلس میں
کارفرما ہیں۔

(۴) جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

عام طور پر یہ خیال ہے اُردو زبان میں صرف شعر و شاعری کا
ذخیرہ متقدمین کی کوشش سے جمع ہوا۔ علوم و فنون کے
سرمایہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ مگر یہ خیال قلّت معلومات
پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ایک صدی سے اُردو کو سائنس کے
سرمایہ سے بامایہ بنانے کی کوششیں جاری رہی ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے

سب سے اوّل نمایاں کوشش حیدرآباد دکن کے مشہور امیر کبیر نواب شمس الامرا فخر الدین خاں بہادر نے کی۔ نواب صاحب ممدوح نے ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں (یعنی آج سے تقریباً سو برس پہلے) سائنس کی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ ان میں سے ایک مجموعے کا نام (شمس الامرا کی مناسبت سے) ستہ شمسیہ ہے۔ یہ چھ رسالے حسب ذیل علوم کے ہیں :-

(۱) جر ثقیل (۲) ہیئت (۳) علم آب (۴) علم ہوا (۵) علم انظار (۶) علم برق و گیلوی نزم و مقناطیس۔

ان رسالوں کے ترجمہ کی کیفیت خود نواب صاحب کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے :-

"حمد و نعت کے بعد بندۂ نیاز مند درگاہ ایزدی کا فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ون کے از بر تھے۔ اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ علم جر ثقیل اور علم انظار وغیرہ۔ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعض علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پاتے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے

فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے
ایسی ترجمہ کی جائے کہ فرصت قلیل میں اُس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ
کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو
طالبوں کے ذہن پر اُس کے مطالعہ کا بار ہوگا .... چنانچہ ان
دنوں میں بحسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے
لکھے ہوئے ریوے رانٹ چارلس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء
میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے ہم پہونچے ...... میر امان علی
دہلوی اور غلام محی الدین حیدرآبادی اور مسٹر جونس اور موسی تندوسی کو
جو ملازمانِ سرکار میں حکم کرتے ہیں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی
سے اُردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں۔ چنانچہ بفضل حق سبحانہ
تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے۔ مگر بعضے اسما اور انگریزی اصطلاح کے
جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے اُن کو اُسی زبان اصلی پر
بحال رکھنے میں آیا۔" ....

یہ رسالے ۱۲۵۶ھ میں سرکار شمس الامرا کے چھاپہ خانہ میں ٹائپ میں
چھپے ہیں۔ من جملہ ستہ شمسیہ کے دوسرا، پانچواں اور چھٹا رسالہ میرے پاس بھی
ہے۔ اشکال اور نقشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت اہتمام اور صحت کے ساتھ
مثل انگریزی نقشوں کے چھاپے گئے ہیں۔ ایک دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ
ان رسالوں کا طرز املا بجنسہ وہی ہے جو آج کل رائج ہوا ہے اور جس کو پنجاب سے
منسوب کرتے ہیں۔ یائے معروف اور یائے مجہول اور اظہار نون اور

اخفائے نون کا املا ٹھیک آج کل کے قاعدہ کے بموجب ہے۔ نیز ناموں پر اور خاص خاص الفاظ پر خط بھی کھنچا ہوا ہے۔ شمس الامراء بہادر نے صرف ترجمہ اور اشاعت پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اُن کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی جاری کیا جس کا نام مدرسۂ فخریہ تھا جس کے مٹے ہوئے سے نشان اب تک باقی ہیں۔

ایک مکمل نسخہ ستۂ شمسیہ کا میرے یہاں مطبع اسلامیہ مدراس کا چھپا ہوا ہے جو ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالے پبلک میں مقبول بھی ہوئے۔

اس کے علاوہ اور بھی شخصی کوششیں سائنس کو زبان اُردو میں لانے کی ہوتی رہیں۔ چنانچہ ڈی ٹاسی اپنے لیکچر (۳ دسمبر ۱۸۵۱ء) میں لکھتا ہے:

"ہندوستانی زبان کی اُن کتابوں میں سے جو حال میں شائع ہوئی ہیں بہت سی سائنس، جغرافیہ، قانون اور دوسرے علوم پر ہیں۔"

دہلی کالج نے بھی علمی تراجم کی خدمت انجام دی تھی۔ مگر یہ تمام کوششیں نورِ علم کے پھیلانے میں وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو سورج نکلنے سے پہلے روشنی کا ہوتا ہے۔ ابھی طلوعِ آفتاب کا انتظار تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں طالع ہوا۔

جامعۂ عثمانیہ اس عہد کا ایسا شاندار اور نتیجہ آفریں کارنامہ ہے جس نے علاوہ علوم و فنون کی حقیقی خدمت کے زبانِ اُردو کو اس قابل بنا دیا ہے کہ علمی زبانوں کی مجلس میں شامل ہو سکے

اِس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد حضور نظام کے فرمان مبارک مسترشدہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ میں حسب ذیل درج ہے:-

"ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دُور ہو کر جسمی، دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبا کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو۔ اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دیا جائے، مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔"

"غور و خوض کے بعد اس فرمان واجب الاذعان کی تعمیل میں محکمۂ تعلیمات سرکار عالی نے فوراً جامعہ کی عملی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے ابتدائی کام شروع کیا۔ اور اُس کے شعبۂ فنون و دینیات کی نصاب پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اور اُن کمیٹیوں نے نصابوں کے جو مسوّدے تیار کئے وہ انگلستان اور ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں گشت کرائے گئے۔ اور ترقی خواہانِ جامعہ کو اس امر کے علم سے اطمینان ہوا کہ تعلیم کے متعلق جن نتائج پر وہ پہونچے تھے اُن کو تعلیم کے سربرآوردہ ماہروں نے کم و بیش پسند کیا۔"

"جامعہ کا یہ پہلا تعمیری کام تھا کہ ایک شعبۂ تالیف و تراجم قائم ہوا جس میں اوّلاً آٹھ قابل مترجموں کا تقرر عمل میں آیا اور یہ کام ملک کے ایک مشہور ادیب اور مصنف کی نگرانی میں دیا گیا۔"

بہت صبر آزما کام وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس پر جاں فشاں مباحث ہوئے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف علوم کے ماہر علما کی ایک کمیٹی شعبۂ ہذا کے ساتھ ہے جو وضع اصطلاحات کی خدمت انجام دے رہی ہے۔

مہر ۱۳۲۸ف م اگست ۱۹۱۹ء میں "کلیۂ جامع عثمانیہ" (عثمانیہ یونیورسٹی کالج) کا افتتاح ہوا۔ پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ کا ۱۹۲۱ء میں اور بی اے کا ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اب یونیورسٹی ایم اے تک تعلیم دے رہی ہے۔ شعبۂ فنون میں حسب ذیل فنون کی تعلیم جامعۂ عثمانیہ میں بزبان اردو ہو رہی ہے:

تاریخ (مشرقی و مغربی قدیم و جدید) فلسفہ، معاشیات، ریاضیات (نظری و عملی)، طبعیات، کیمیا، قانون، نباتیات، حیاتیات، انجنیری، طب (ڈاکٹری)۔ ممتحن باہر کے علما بھی ہوتے ہیں۔ ان علما کی جو رپوٹیں نتائج امتحان کی بابت موصول ہوتی ہیں اُن میں تسلیم کیا گیا ہے کہ طلبا نے خوب سمجھ کر پڑھا اور ان کے جوابوں سے خیالات کی جدّت اور تازگی ظاہر ہوتی ہے۔ متعدد انٹرمیڈیٹ کالج اس یونیورسٹی سے ملحق ہو چکے ہیں۔ جن میں ایک زنانہ بھی ہے۔ مستقل عمارت کے لئے چودہ سو ایکڑ زمین حاصل ہو چکی ہے۔ ایک کروڑ روپیہ مصارف کے لئے منظور فرمایا گیا ہے۔ سالانہ مصارف دس لاکھ روپیہ سے زائد ہیں۔

دارالترجمہ نے اب تک ایک سو گیارہ ۱۱۱ کتابیں حسب ذیل علوم کی شائع کی ہیں:

(انگریزی سے ترجمہ ہوئیں) فلسفہ ۹ - قانون ۴ - سائنس ۴۴ - ریاضی ۱۵ -
معاشیات ۲ - تاریخ ۴۵ - جغرافیہ ۲ - جملہ ۱۰۱ -
(عربی سے ترجمہ ہوئیں) فلسفہ ۱ - تاریخ ۴ - جملہ ۵
(فارسی سے ترجمہ ہوئیں) تاریخ ۵ -
ستر کتابیں ترجمہ ہونے کے بعد بعض زیر نظر ثانی ہیں یا طبع ہو رہی ہیں
ان میں ۹ ڈاکٹری کی ہیں اور ۹ انجنیری کی - ۶۵ کتابیں زیر ترجمہ ہیں -
جملہ ۲۴۶ -

علاوہ تراجم کے ۸ کتابیں تالیف ہو چکی ہیں - ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں نے جامعۂ عثمانیہ کو تسلیم کر لیا ہے اور انگلستان میں شمالی مجموعے نے (Northern Groups.) - آکسفورڈ اور کیمبرج اور لندن کی یونیورسٹیاں یہاں کے طلبا کو اسی رعایت سے اپنے یہاں داخل کرتی ہیں جس رعایت سے ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا کو داخل کرتی ہیں - انگلستان کے انڈین سول سروس کے امتحان میں بھی جامعۂ عثمانیہ کے طلبا کا داخلہ حکومتِ ہند منظور فرما چکی ہے -

خاتمہ

میں ممنون ہوں کہ آپ نے میری پریشان بیانی صبر و تحمل سے سماعت فرمائی - مجکو اردو کے متعلق ماضی و حال کی جو داستان کہنی تھی عرض کر چکا اب مذکورۂ بالا بیان پر ایک نظر اور چند خیالات کا اظہار خاتمۃ الباب ہے -

اُردو کی جو تاریخ مختصراً میں نے عرض کی ہے اُس سے واضح ہوا ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش دیسی اور پردیسی زبانوں کے میل جول سے ہوئی ہے۔ زبانوں کا یہ میل جول ابتدا ہی سے اُس ربط اور اُنس کا نتیجہ تھا جو اہلِ زبان کے باہم پیدا ہوا۔ تاریخ سندھ کا جو واقعہ شروع میں عرض کر چکا ہوں وہ ابتدائی ربط کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ زمانۂ مابعد میں کیا ہوا؟ اُس کی کیفیت حال کے سب سے زیادہ مشہور ملکی مورّخ کی زبانی سننی مناسب ہوگی۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے سال حال کے آغاز میں جو پُر مغز تاریخی لکچر مدراس یونیورسٹی کی سرپرستی میں بمقام مدراس بہ عنوان (India through the Ages) دیئے اُن میں مسلمانوں کے عہد کی حسب ذیل ذیل نعمتیں شمار کی ہیں۔ خلاصۃً

(۱) بیرونی ممالک سے ازسرِنو تعلقات۔

(۲) اندرونی امن۔

(۳) انتظام کی یکسانی۔

(۴) شرفا میں خواہ کسی مذہب کے ہوں لباس و رسم کی یکسانی۔

(۵) انڈو سیرین دستکاری جس میں قرونِ وسطیٰ کے ہندو اور جینی اسکول سموئے گئے ہیں۔ ایک نئی طرزِ عمارت۔ لطیف مصنوعات کی ترقی (یعنی شال پچیکاری، کمخواب، ململ، قالین وغیرہ)۔

(۶) ایک عام زبان جس کا نام ہندوستانی یا ریختہ ہے اور سرکاری نثر کی طرز (جو زیادہ تر ہندو منشیوں نے تحریر فارسی میں ایجاد کی اور جس کو مرہٹہ

چٹ نویسوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا)

(۷) ہماری دیسی زبان کا عروج جو اس امن اور مال خوشحال کا نتیجہ تھی جو دہلی کے شہنشاہی دور میں نصیب ہوئی۔

(۸) توحید مذہب کا احیاء اور تصوّف۔

(۹) تاریخی ادب۔

(۱۰) ملکی اور جنگی آئین میں ترقیاں۔

اس فہرست پر ایک نظر ہی ثبوت اس امر کا ہے کہ عہد مذکور میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے کس طرح مل کر باہمی کوشش سے صنعت، زبان اور آئین کو ترقی دی۔ امن اور خوشحالی نے جو شگفتگی دلوں اور دماغوں میں پیدا کی اس کا جلوہ جمنا کے کنارے تاج کی صورت میں اور بزم عیش میں تائین و شمال کی شکل میں نمایاں ہوا۔ اسی ربط کی بہار نے اردو ادب کو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مقبول بنا دیا۔ آج ریاست میسور میں اردو اسکول جاری ہیں۔ گزشتہ سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مدراس میں ہوا تو اس میں ایک رزولیوشن یہ پاس ہوا کہ آندھرا یونیورسٹی میں اردو میں تعلیم کا بھی اہتمام ہو۔ ہندوستان کے باہر کابل کے کالج میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ حجاز کی بندرگاہ جدہ میں ایک دری کے بیچنے والے حبشی کو صدا لگاتے سنا[۱] "دری لو دری"۔ آسام [illegible] مسلمانوں کی سلطنت کو کبھی استقلال حاصل نہیں ہوا اردو کے زیر نگیں

---

[۱] سیاحت نامہ منشی شمس الدین صاحب۔

آجاتا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ نہ صرف اُردو کی ترقی عہد گزشتہ میں ہوئی بلکہ تمام دیسی زبانوں نے فیض پایا۔ بنگالی زبان کی نسبت بنگال کے مشہور اہل قلم ڈاکٹر دنیش چندر سین رائے بہادر لکھتے ہیں۔

"ہمارے علم ادب کا سب سے ممتاز دور چوتھا ہے جس کا آغاز وشنویوں سے ہوتا ہے جنھوں نے سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کے اثر سے متأثر ہوکر سوسائٹی کے شیرازہ کو اتحاد و اخوت عامہ کے اصول پر دوبارہ درست کیا۔ وشنویوں کے ادب میں فطرت انسانی کی نزاکت اُس کے حسن کی لطافت اور نفاست کی تصویر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بلند تر پایۂ کمال کا حاصل کرنا ممکن نہیں -------- اس زمانہ میں سر رابندر ناتھ ٹیگور نے اسی وشنوی چمن سے گل چینی کی ہے -------- بنگال میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی علم ادب کی ترقی میں ساتھ دیا۔ اس زمانہ میں ان دونوں قوموں میں باہمی مدارات اور روا داری کے خیالات اس قدر قوی تھے کہ آج کل کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے والو کو اُس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ بہت سی بنگالی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ایسے مسلمان بزرگوں کے حالات درج ہیں جنھیں ہندو مسلمان دونوں مقدس سمجھتے تھے"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :-

"ہماری زبان اور علم ادب دراصل ملک کی ملی جلی آبادی اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے[1]"

---

[1] مضمون ڈاکٹر دنیش چندر سین رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۴۴ و ۳۶۱

اِسی مضمون کے حواشی کے نمبر ۳ تشریح میں بیان کیا ہے کہ بنگالی ادب کی ترقی میں اسلامی توحید نے حصۂ عظیم لیا۔

اب ایک دوسرے دیسی ادب پر نظر ڈالیے۔ یعنی برج بھاشا۔ گرئرسن کی جس تاریخ کا ہم نے اوپر کئی جگہ حوالہ دیا ہے اُس میں مغلیہ سلطنت کے عہد کو برج بھاشا، بیسواڑی اور بہاری زبانوں کا دورِ اقبال (Augustan Age) بتایا ہے۔ لکھا ہے کہ:

"اُس لٹریچر کی قدر ہمایوں بادشاہ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ملک محمد جائسی نے میدانِ ترقی میں قدم رکھا۔ شاہانِ مغلیہ بہت بڑے مربّی ان زبانوں کے تھے۔ اُن کے زوال کے ساتھ یہ بھی تباہ ہوگئیں۔ مرہٹوں کا زمانہ ان زبانوں کی ادبی ویرانی کا تھا۔" خلاصہ

ذرا اس جان پرورِ عالم کو دیکھو کہ اکبری نورتن کے جوہر فرد خانِ خاناں کی مجلس میں ایک طرف عرفی و نظیری کی تربیت و قدردانی ہو رہی ہے۔ دوسری جانب سورداس اور تلسی داس (رامائن کے مؤلف) کی۔ اکبر جہاں سلطنت کو بڑھا رہا ہے وہاں فنونِ لطیفہ کی پرورش میں بھی مصروف ہے۔ فنِ تعمیر مقبرۂ ہمایوں تک ترقی کر گیا ہے جس کی دوسری منزل آگرہ کا تاج تھا۔ فنِ مصوری میں ایرانی اور ہندو دونوں مصوریاں مل کر وہ چہرے تیار کر رہی ہیں جن پر نادرِ زمانی منصور اور میر کلاں کو ناز ہے۔ فنِ موسیقی میں میاں تان سین کی قدردانی ہے جو گوالیار کے مشہور عارف باللہ حضرت محمد غوث کے دامنِ شفقت کے سایہ میں اکبری دربار میں پہونچتے ہیں۔ فارسی ادب سحرِ حلال کا رنگ پیدا کر رہا ہے،

فیضی کی نل دمن تصنیف ہو رہی ہے تو تلسی داس رامائن لکھنے میں مصروف ہیں۔
گرائرسن نے تلسی داس کی تعریف جس بلند آہنگی سے کی ہے اُس سے زیادہ
مشکل ہے۔ لکھا ہے کہ :

"گوتم بدھ کے بعد ہندوستان نے ایسا سپوت پیدا نہیں کیا۔ توحید
اور صحّت نظر نے اُس کے کلام کو حقیقت کا راز داں بنا کر بقائے دوام کا
خلعت دیا۔"

سوال یہ ہے کہ توحید اور صحّتِ نظر کہاں سیکھی ؟ جواب واقعات سے سُنو۔
اسی اکبری دربار میں۔ توحید تو وہی ہے جس نے بنگال ادب کو سنبھالا۔ صحتِ نظر
میں مغلوں سے کوئی بازی لے جائے گا؟ واقعات بابری اور تزک جہانگیری
میں اس کا روشن ثبوت دیکھ لو۔ گرائرسن نے اپنی مذکورۂ بالا تاریخ میں
تلسی داس کی ایک دستی تحریر کا عکس شامل کیا ہے۔ یہ فارسی خط میں ہے جس میں
ایرانی شان ہے۔ سرلوح "اللہ اکبر" لکھا ہے۔ اس سے سمجھ لو کہ تلسی داس کے
ادب میں کیا رنگ جلوہ فرما تھا۔ ادب اُردو اسی الفت کے سایہ میں پرورش
پاتا رہا۔ ہندوستان میں طوائف الملوکی ہوئی۔ سارا ملک میدان کارزار تھا۔ تاہم
اوّل تو "مہاپاپ" ہندو مسلمان سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوسرے ادب کی
مجلسیں الفت کے وہ میخانے تھیں۔ جہاں دلوں کی ساری کلفتیں دُور
ہو جاتی تھیں ؎

دماغِ دل درین جا گاہ گاہے چاق میگردد
خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را

ذکرِ میر جو حال میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہے ملاحظہ ہو۔ یہ میر تقی میر کی لکھی ہوئی آپ بیتی کہانی ہے۔ وقت وہی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا۔ ہر طرف سے حوصلہ مندی تلواریں کھینچ کر میدان میں آکودی۔ خود میر صاحب بھی لڑائی کے معرکوں میں شریک ہیں۔ مگر ساری کتاب پڑھ کر فرقہ بندی یا تفریقِ مذہب کی بو بھی دماغ میں نہیں آتی۔ مثلاً پانی پت کا دَوران معرکہ میر صاحب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مگر ایک حرف ایسا نہیں لکھتے جس سے نفرت یا تنگ خیالی عیاں ہو۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں :

"حقیقتِ ہر دو لشکر آں کہ اگر دکھنیاں جنگِ گریز کہ طور قدیم آنہا بود می جنگیدند اغلب کہ غالب می گردیدند"

مرزا غالب کے جس تیرِ الفت کے گھائل میر مہدی مجروح ہیں اُسی کے کشتہ مرزا ہرگوپال تفتہ ہیں۔ اسی نشۂ الفت کی رسائی تھی کہ ادبِ اُردو کی پرورش ہندو مسلمانوں نے مل کر ابتدا سے آخر تک کی۔ اُردو شعرا کے تذکرے دیکھو۔ شمالی ہند میں پہلا دور خان آرزو سے قائم ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ رائے آنندرام مخلص ہیں، ٹیک چند بہار ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقم ہیں۔ اپنے وقت میں رائے سرب سنگھ دیوانہ اُستادِ وقت ہیں۔ جن کے ایک شاگرد جرأت کے اُستاد بھی ہیں یعنی حسرت۔ گلزارِ نسیم کے مؤلف نسیم لکھنوی کو سارا ہندوستان مانے ہوئے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

یہ تو شعرا تھے۔ ہندو امرا نے بھی قدردانیوں سے دل بڑھا کر کمال کی سرپرستی کی۔ راجہ شتاب رائے ناظم بنگال و بہار کی قدردانی مشہور ہے۔

اُردو شعر بھی کہتے تھے۔ اُن کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ اُردو کے شاعر تھے۔ میر تقی میر جن جن کے ممنون کرم ہیں اُن میں راجہ جگل کشور بھی ہیں۔ مہاراجہ چندولال کی قدردانیاں آج تک ضرب المثل ہیں۔ پٹنہ میں دور آخر میں کنور سکھ راج بہادر نے (جو معاصر تھے شاہ اُلفت حسین فریاد اُستاد سید محمد علی شاد مرحوم کے) اُردو کے ایسے مشاعرے کئے کہ اب تک یاد ہیں۔ ہر مشاعرے میں تین چار ہزار روپیہ خرچ کرتے تھے۔ (حیات فریاد از شاد)

آج بھی دکن میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی سرکار قدردان شعراء ہے۔ جب تک اُردو کا ادبی دور رہا یہ میخانۂ الفت "با مہر ونشان" رہا۔ دفتری دور میں دوسرے ہی رنگ کھلے۔ اور یہی بحثیں چھڑیں۔ نتائج آج آنکھوں کے سامنے ہیں۔

زیادہ شکوہ عربی فارسی کی آمیزش کا ہے۔ افراط ہر چیز میں بُری ہے۔ آمیزش اعتدال کی حد تک رہ کر بھی قابل اعتراض ہو تو سوال یہ ہے کہ اُردو کو زبانِ عام بننے کی قوت کس نے بخشی؟ ہمارے ملک میں ہزاروں زبانیں ہیں جن کی تفصیل سر جارج گرائرسن کی ایک شتر بار تصنیف میں سمائی ہے۔ مگر یہ سب کی سب اپنے ہی دائرے میں ہیں۔ اگرچہ بعض نے اُن میں سے بہت کچھ ترقی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ عربی فارسی کی آمیزش صرف اُردو ہی میں تو نہیں۔ ملک کی دوسری زبانیں بھی اُن سے فیض یاب ہیں، مثلاً بنگالی۔ بابو صاحب کی جس تحریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اُسی میں ایک مایۂ ناز بنگالی مصنف کی نسبت لکھا ہے:-

"اس شخص کی تحریر گویا ایک قسم کی پچیکاری ہے جس میں فارسی کو بنگالی کے ساتھ وصل کیا ہے۔"

اس مؤلف کی تصانیف کو مضمون نگار نے بنگال کے "ادبی جواہرات" میں شامل کیا ہے۔ ترقی یافتہ مرہٹی زبان میں پچیس فی صدی الفاظ فارسی کے ہیں[1]۔ گوشہ نشین زبان "کوکنی" میں بھی دس فی صدی "ساخی" الفاظ (عربی فارسی) ہیں[2]۔

نینی تال کے قریب سرد ہواؤں سے جب میدانی تپش سے جھلسے ہوئے مسافروں کے تن بدن میں جان آتی ہے تو اُن کی آنکھیں ایک روح پرور چشمے سے ٹھنڈی ہوتی ہیں جو سنگ مرمر کے شفاف گئو مکھ سے گرتا ہے۔ اس چشمہ پر سنسکرت کا یہ مقولہ لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ اُردو میں بھی درج ہے:

"جو کوئی آدمی پانی کے چشمہ کو نقصان پہنچاتا ہے وہ دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔"

کیا یہ رشیوں کا قول ہماری عبرت کے لیے کافی نہیں جو ادب کے سرچشمہ کو جو پریم کا امرت پلاتا تھا، زہر آلود کرتے ہیں۔ کیا اس کا وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم محض ملک اور نیشن کی بہبودی کے لیے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ جو زبان رفتہ رفتہ ترقی کرکے ملک کی عام زبان بن چکی ہے، جدید علوم و فنون کی درس تدریس کی استعداد پیدا کر چکی ہے اُس کی سرپرستی کریں اور سب کے سب مل کر

---

[1] رسالہ اُردو اپریل ۱۹۲۱ء [2] رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۲۲ء

پھر اس بادۂ الفت سے سرشار نظر آئیں۔ ہمارے بچے بقول ایک ماہر تعلیمات کے سوتیلی ماں کا دودھ چھوڑ کر سگی ماں کے دودھ سے پرورش پائیں۔

اسی سلسلے میں یہ تجویز شاید بے جا نہ ہو کہ اس اجلاس شعبۂ اردو کی یادگار میں پنجاب میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہو۔ جو متفقہ کوشش سے پنجاب میں اردو کی قدیم نشو و نما کی تحقیقات کرے اور پروفیسر شیرانی نے جس کام کا آغاز "پنجاب میں اردو" لکھ کر کر دیا ہے اس کو انجام تک پہونچائے۔

لطف و کرم کا شکریہ سپاس مہر خاتمہ ہے۔

حیدرآباد (دکن) **محمد حبیب الرحمن خاں (صدر یار جنگ)**

علمائے سلف ہماری قومی زبان اُردو کے مشہور مصنّف مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی نہایت مقبول تصنیف (جو عربی کی مستند ترین تاریخی کتابوں کے تقریباً چھ ہزار صفحات کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے) اس کتاب سے ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر علم کا کس قدر ذوق تھا اور مسلمان علمار کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کی کیا کیفیت تھی مختصر یہ ہے کہ ایسی کتاب دُنیا کی کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ کتاب کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان اور زبان کی پاکیزگی کے ساتھ لکھائی چھپائی بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔

نابینا علمار علمائے سلف کے سلسلہ میں یہ رسالہ ان مسلمان علمار کے حالات میں ہے جنھوں نے سر کی آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود علم کے نور سے نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے دل و دماغ کو منور کیا۔ دنیا کی ہر زبان میں ایسے رسالے بہت کم ہیں۔ اُردو زبان میں یہ سب سے پہلا اور اب تک واحد رسالہ ہے۔

نقشِ وفا حقوق و فرائض زوجین کے متعلق نہایت بیش بہا نصائح و مفید ہدایات دستور العمل بنانے کے قابل ہیں نوشتۂ جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی حسرت و جناب نفیس دلہن صاحبہ دُرِ دانہ۔

ملنے کا پتہ: شروانی بک ڈپو۔ شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ